محسن انسانیت

صلی اللہ علیہ وسلم

مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے

(۲) مدنی دور

تاریخ موڑ مڑتی ہے۔

❖ ....

............صبح صبح جب ام احمد نے مجھے عازم سفر دیکھا کہ میں اس ہستی کی حفاظت میں نکل رہا ہوں، جس سے بن دیکھے خوف وخشیت رکھتا ہوں۔

............تو وہ کہنے لگی کہ اگر لازماً تمہیں یہ اقدام کرنا ہی

ہے تو یثرب جانے کا خیال چھوڑو اور ہمیں کسی دوسرے علاقے میں لے چلو!

..........اس پر میں نے اسے جواب دیا کہ بس اب تو یثرب ہی ہماری منزل مقصود ہے اور خدائے رحمان جدھر چاہتا ہے، بندہ ادھر ہی سوار ہو کے نکلتا ہے!

..........کتنے ہی چہیتے ساتھیوں اور کتنے ہی خیر خواہوں کو ہم نے پیچھے چھوڑا اور کتنی ہی غمگسار خواتین تھیں کہ جو آنسو بہاتی اور شیون کرتی رہ گئیں۔

..........تم سمجھتی ہو کہ ہمارا ترک وطن اس غرض سے ہے کہ ہم جلا وطن کرنے والوں سے انتقام لینے کے قابل ہوں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کچھ اور ہی مقاصد ہیں جن کی ہمیں تمنا ہے۔

..........ایک ہم ہیں، اور ایک ہمارے دو دوست ہیں

جو راہ راست سے دور ہٹ گئے ہیں اور انھوں نے ہمارے خلاف ظلم کے ہتھیار اٹھائے اور ہنگامہ برپا کردیا۔

..........یہ کشمکش کرتے ہوئے دو فریق ہیں جن میں سے ایک کو حق کی علمبرداری کی توفیق ملی ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہے۔ دوسرا فریق خدا کے عذاب کی زد میں آنے والا ہے۔

..........اگرچہ ہم ان کے ساتھ ارحام کے لحاظ سے گہری قرابتیں رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں (نظریات و مقاصد کا) دلی رشتہ نہ جوڑا گیا ہو، وہاں محض ارحام کی قرابت نہیں چل سکتی!

..........ایک دن آئے گا جبکہ تمہاری وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی اور تمہارے اجتماعی نظم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

..........اس وقت تم اچھی طرح جان لو گے کہ ہم دونوں گروہوں میں سے کون ٹھیک حق پر کاربند ہے۔

(تلخیص......رجزِ ہجرت......ابو احمد بن جحش)

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع وجب الشکر علینا مادعاللہ داع ایھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع۔

انسانیت کے محسن اعظم اور دنیا کے سب سے بڑے تاریخ ساز حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامہ حیات کا مکی دور دعوت وپیغام کا دور ہے اور مدنی دور اقتدار کا دور ہے، مکہ میں افراد تیار کیے گئے مدینے میں اجتماعی نظم کی تشکیل ہوئی۔ یہاں مسالہ تیار ہوا، وہاں عمارت کھڑی کی گئی۔

اس فرق کی وجہ سے قرآن اور سیرت وتاریخ کو سرسری نگاہ سے دیکھنے والے عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ اسلامی تحریک اور اس کے داعی پر امتحان کی کڑی گھڑیاں صرف اور یہاں اس طرح کی بھٹیاں گرم نہ ہوتی تھیں۔ یا کم سے کم خیال یہ کیا جاتا تھا کہ مخالفت اب ایک ننگی تلوار بن کر میدان جنگ میں آگئی تھی اور مخالفین کی طرف سے گھٹیا حرکات اور ذلیل کارروائیوں کا وہ

دور گذر گیا تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بلاشبہ قریش کی اولین مخالف طاقت تو اب رو در رو ہو کر میدان جنگ میں چیلنج کر رہی تھی، لیکن دوسری طرف مدینہ میں تحریک کی پر زور اٹھان نے نئی مخالف طاقتیں ابھار دی تھیں اور وہ شر انگیزی میں اہل مکہ سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ اب شر انگیزی کے نت نئے کرشموں نے داعی حق اور اس کے رفقاء کو شروع سے آخر تک پریشان کیا اور تمدن کی تعمیر نو کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

تاریخی کلیہ یہی ہے کہ اصلاح و تعمیر کا کام جتنا جتنا آگے بڑھتا ہے۔ اصلاح دشمن اور جمود پسند طاقتیں اس کو تباہ کرنے کے لئے جذبات عداوت میں اتنی ہی زیادہ بہکتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ حق جب مظلومی کے تختۂ دار سے ایک جست لگا کر تخت اقتدار پر قدم رکھتا ہے تو باطل کا بغض و حسد بھی ساری حدوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ یہی صورت مدینہ میں نئی مسلم

سوسائٹی کے قیام اور امن وسلامتی کی ریاست سے پیدا ہونے پر پیدا ہوئی۔

مدینہ کی مختلف فضاء

تاریخی لحاظ سے یہ صورت واقعہ بجائے خود بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مدینہ کی سیاسی و مذہبی فضاء مکہ سے بالکل مختلف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دین حق کی جو نیری وہاں تحت ناسازگار حالات سے دوچار تھی، یہاں لاکر جونہی نصب کی گئی تو تیزی سے برگ وبار لانے لگی۔

پہلی بات یہ کہ مکہ اور اس کے ماحول کی ساری آبادی باہم دگر مربوط تھی اور مذہبی قبیلوی اور معاہداتی بندھنوں اور بندھی ہوئی تھی اور قریش کا اس پر پورا تسلط تھا۔ لیکن مدینہ اور اس کے ماحول میں دو مختلف عناصر آباد تھے جن کے درمیان کھنچاؤ موجود تھا۔

مدینہ یثرب کے نام سے یہودیوں کا آباد کردہ قدیم شہر

تھا۔ یہاں جوں جوں ان کی نسل پھیلتی گئی، مدینہ کے آس پاس

ان کی نئی بستیاں قائم ہوتی گئیں اور ساتھ کے ساتھ ان کے

چھوٹے چھوٹے جنگی قلعے تعمیر ہوتے گئے۔ چنانچہ پورا علاقہ

یہود کے مذہبی وسیاسی تسلط میں تھا۔

دوسرا عنصر انصار کا تھا۔ ان کا اصل وطن یمن تھا اور

قحطان کا خاندان ان کا نسلی سرچشمہ تھا۔ جس زمانے میں سیل عرم

نامی مشہور سیلاب نے تباہی مچائی تھی اور بچے کھچے لوگ ادھر ادھر

منتشر ہوئے تھے، اسی زمانے میں قحطان کے قبیلے میں سے اوس

اور خزرج نام کے دو بھائی یثرب آپہنچے اور یہاں آباد ہو گئے

ہوسکتا ہے کہ بعد میں اور لوگ بھی آئے ہوں۔ تاہم انہی

نوواردوں کے ذریعہ اس علاقے میں نئے عنصر کا اضافہ ہوا۔ بعد

میں نسل بڑھتی گئی اور آہستہ آہستہ ایک نئی طاقت ابھرنے لگی۔

شروع شروع میں ان لوگوں نے یہودی معاشرے اور تمدن سے

منقطع رہ کر پنپنا چاہا۔ لیکن پہلے کی جمی ہوئی طاقت کے زور واثر سے دب کر ان سے دوستانہ معاہدہ استوار کر لیا۔ معاہدانہ تعلقات دیر تک خوش اسلوبی سے چلتے رہے۔ لیکن یہود نے جونہی یہ محسوس کیا کہ انصار کی روز افزوں ترقی ان کے اقتدار کے لئے ایک خطرہ بنتی جا رہی ہے انہوں نے حلیفانہ تعلق توڑ لیا۔

یہود کے اندر ایک عیاش رئیس فطیون نامی اٹھا۔ اس نے جبر وقوت سے اپنا یہ حکم نافذ کر دیا کہ اس کی حدود میں جو لڑکی بھی بیاہی جائے وہ اس کے شبستان عیش سے گذر کر ازدواجی زندگی کے دائرے میں داخل ہو۔ یہود کے بگاڑ کا اس سے اندازہ کیجئے کہ انہوں نے فطیون کے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس شیطانی حکم نے انصار کی غیرت کو بھی چیلنج کر دیا۔ مالک بن عجلان کی بہن کی شادی ہو رہی تھی کہ عین بارات کے دن وہ بھائی کے سامنے سے پورے انداز بے

حجابی کے ساتھ گزری مالک نے ملامت کی تو اس نے کہا کہ کل جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے زیادہ شدید ہے۔ چنانچہ مالک نے فطیون کو قتل کر دیا اور شام کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں غسانی حکمران ابو جبلہ کا سکہ چل رہا تھا۔ اسے یہ حالات جب معلوم ہوئے تو اس نے حملہ کر کے بڑے بڑے یہودیوں کو قتل کیا۔ اور اوس وخزرج کو خلعت وانعام سے نوازا۔ ان واقعات نے یہود کا زور توڑ دیا۔ اور انصار کی طاقت بڑھا دی۔

غرض یہود کے مقابلے میں انصار کا معاملہ برابر کا چوٹ کا معاملہ تھا۔ لیکن اصول ومقصد کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اتحاد مضبوط بنیاد نہیں رکھتا تھا۔ آپس کی کشمکش نے دیمک بن کر طاقت کو چاٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اوس وخزرج کے درمیان جنگ بعاث واقع ہوئی اور فریقین کے نہایت قیمتی افراد ایک دوسرے کی تلواروں کا نوالہ ہو گئے۔ اس طرح یہود کے سامنے وہ پھر بے زور ہو کر رہ گئے اسی حالت سے مجبور ہو کر انہوں نے

قریب کے زمانے میں قریش کے سامنے حلیفانہ تعلقات کی درخواست رکھی تھی۔ لیکن بعض وجوہ سے یہ کوشش ناکام رہی۔

دوسری طرف یہود کے تفوق کی ایک وجہ ان کی مذہبی سیادت بھی تھی۔ ان کے پاس تورات تھی۔ اور وہ ایک مستقل مذہبی نظام کے علمبردار تھے۔ ان کے پاس ایک سرمایۂ اعتقاد تھا۔ ایک اخلاقی ضابطہ تھا۔ فقہی احکام تھے۔ مذہبی قانون تھا۔ کچھ روایات تھیں اور عبادات کی انجام دہی کا ایک طریقہ تھا۔ انصار اس پہلو سے تہی داماں تھے اور وہ اس دائرے میں ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور تھے۔ انہی کے بیت المقدس (یہودیوں کے مذہبی تعلیم کے مراکز) سے وہ استفادہ کرتے تھے۔ حد یہ کہ اگر کسی انصاری کی اولاد زندہ نہ رہتی تھی تو وہ نذر رہی ییا تا تھا کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنایا جائے گا۔ انصار میں اس پہلو سے احساس کمتری موجود تھا اور ان کی غیرت و حمیت اس پر کرب محسوس کرتی تھی۔

اوپر کے حقائق کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مدینہ کے ماحول میں یہود اور انصار کے درمیان کھچاؤ تھا اور تعلقات کی گہرائی میں حریفانہ و رقیبانہ جذبات کام کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہود و انصار کے سامنے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ آخری نبی جلد ہی مبعوث ہونے والا ہے وہ آ لے تو پھر ہم اس کے ساتھ ہو کر تمہاری خبر لیں گے۔ یہود کی اس پیش گوئی نے انصار کو بھی اس پیغمبر موعود کا منتظر بنا دیا تھا اور ان کے اندر ایک شعوری رجحان یہ کام والے خود تو محروم رہے اور جن کو وہ دھمکیاں دیا کرتے تھے۔ وہ نبی آخر زماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلقۂ رفاقت میں آ گئے۔ یہود جن کو پٹوانا چاہتے تھے ان کے ہاتھوں سے خود پٹ گئے۔ (یہ معلومات سیرت النبیؐ از علامہ شبلی مرحوم (حصہ اول) سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۱۸۹ تا ص ۱۹۱)

مدینہ کی اس فضاء اور اس کے پس منظر کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیوں یہ ماحول مکہ کے مقابلے میں تحریک اسلامی کو زیادہ راس آیا۔

تحریک اسلامی مدینہ میں

مکہ نے دعوت حق سنی اور مسلسل ۱۳ سال سنی۔ اس کا پورا استدلال سامنے آیا۔ اس کے نور سے بھری ہوئی ایک لامثال شخصیت کا کردار اس کے سامنے جگمگاتا رہا۔ اس کے علم برداروں نے ظلم کی چکی میں پستے ہوئے "احد، احد" کی صدا بلند کی مگر مکہ کی اجتماعی فضاء نے شروع سے آخر تک ایک ہی رٹ لگائے رکھی ...."نہیں منظور!"

لیکن مدینہ تک کل دعوت کی نکہت کا پہلا جھونکا ہی پہنچا ہوگا کہ اس کی روح وجد میں آ کر پکار اٹھی۔ "لبیک" مدینہ کا پہلا نوجوان جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام سے بہرہ اندوز ہوا

......سوید بن صامت تھا۔ یہ ایک ذہین شاعر تھا، ایک ماہر سوار تھا، بہادر جنگجو تھا۔ ایسے نوجوان بالعموم انقلابی حرکت کے سپاہی بنا کرتے ہیں اور تعمیر و ترقی کی ہر دعوت پر لبیک کہتے اور پھر اپنا سب کچھ لگا دیا کرتے ہیں۔ یہ نوجوان مکہ میں آیا تو سرور عالم نے حسب معمول مل کر دعوت پیش کی۔ سوید نے بتایا کہ ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے۔ یعنی صحیفہ لقمان! اس کا کچھ حصہ اس نے سنایا بھی۔ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن سنایا، دیکھئے بے تعصبی کا مظاہرہ، سوید کی فطرت سلیم فوراً پکار اٹھی کہ "ان ھذا القول حسن" یعنی یہ کلام خوبی میں بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کلام کا پیغام اس کے دل میں گھر کر گیا لیکن افسوس کہ جانے کے بعد جلد ہی وہ خزرجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں بعد میں لوگوں نے تذکرہ کیا کہ وہ قتل ہوتے وقت مسلم تھا اور تکبیر اس کی زبان پر تھی۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲، ص ۶۸۔۶۷)

متاثر ہونے والا دوسرا یثربی نوجوان ایاس بن معاذ تھی۔ یہ مدینہ کے ایک وفد کا رکن تھا۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ خزرج کے خلاف قریش سے حلیفانہ معاہدہ کریں اور امداد حاصل کریں۔ داعیٔ حق نے ان لوگوں تک بات پہنچانے کا موقع نکالا۔ اسلام کا تعارف کرایا اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ ایاس بن معاذ جو اس وقت لڑکپن کے عالم میں تھا کہنے لگا......"اے قوم! ھذا واللہ خیر مما جئتم بہ" کیا ہی پاکیزہ فطرت بول رہی ہے کہ "اے ساتھیو! تم جس غرض کے لئے آئے ہو اس سے یہ زیادہ بہتر ہے"۔ سردار وفد ابوالحسیر نے مٹی اٹھا کر اس کے منہ پر ماری۔ مطلب یہ تھا کہ یہ تم بیچ میں کیا غضب ڈھا رہے ہو۔ ساتھ ہی کہا۔ "ہم اس مطلب کے لئے نہیں آئے"۔ ابوالحسیر کو فکر تھی قریش کی حمایت حاصل کرنے کی اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان لی تو قریش کے دلوں کے دروازے الٹا اور بند ہو جائیں گے۔ ایاس چپ ہو گیا......

لیکن اس کے دل کی مٹی میں دعوت کا بیج پڑ گیا۔ یہ لوگ واپس لوٹ گئے اور افسوس کہ مدینہ کا یہ بیدار دل نوجوان بھی جلد ہی جنگ بعاث کی لپیٹ میں آ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

نبوت کے گیارہویں سال حج کے لئے مدینہ سے جو گروہ آیا اس سے ایک نشست میں سرور عالمؐ کی بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ آپؐ کی دعوت کو سن کر وہ لوگ آپس میں کہنے لگے......

"اے ساتھیو! جان لو کہ قطعی طور پر یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں یہود تمہارے سامنے پیش گوئی کرتے رہتے ہیں۔ سو اب وہ کہیں تم سے آگے نہ بڑھ جائیں"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کھول دیئے اور انہوں نے دین حق کو اپنے سینوں میں جذب کر لیا۔ پھر وہ کہنے لگے:

"ہم لوگوں نے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑا، دوسری کسی قوم میں ہمارے لوگوں کی طرح دشمنی اور خرابی نہ ہوگی۔ شاید آپؐ کی

ذات کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کو پھر جوڑ جاڑ دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپؐ کے دین کی طرف ان کی دعوت دیں گے اور ان کے سامنے اپنا وہ تاثر رکھ دیں گے، جو اس دین کے لئے آپؐ کے سامنے ہم نے ظاہر کیا ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دین پر جمع کر دیا تو اس کے بعد آپؐ سے زیادہ قوت رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہوگا"۔

مکہ کے لوگوں نے جس دعوت کو موجب تفرقہ گردانا، مدینہ کے لوگوں نے اس میں اپنے لئے اتفاق واتحاد کی بنیاد پہلی نظر ڈالتے ہی دیکھ لی۔ اسلامی تحریک کی علمبرداری کے لئے مدینہ کی یہ پہلی جماعت جس کی تشکیل مکہ میں ہو رہی تھی۔ چھ افراد پر مشتمل تھا۔ (۱) ابوالہیثم بن تیہان (۲) اسعد بن زرارہ (۳) عوف بن حارث (۴) رافع بن مالک بن عجلان (۵) قطبہ بن عامر (۶) جابر بن عبداللہ۔

یہ لوگ لوٹ کر گئے تو ماحول میں انہوں نے ایک نئی

حرکت پیدا کر دی۔ دعوت اسلام پھیلنے لگی اور خوب مقبول ہوئی۔ انصار کے گھرانوں میں سے کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا نہ ہو رہا ہو۔

بیعت عقبہ اُولیٰ

اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں برس بارہ افراد کا وفد آیا اور آکر بیعت کی۔ اس بیعت کو اصطلاحاً ''بیعت النساء'' یعنی زنانہ بیعت کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس بیعت میں صرف بنیادی باتوں کا اقرار لیا گیا تھا اور جنگ و تصادم کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ اس ایمانی قرار کے اجزاء یہ تھے:

''ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ چوری نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، کسی کے خلاف جانتے بوجھتے کوئی من گھڑت بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گے اور کسی معروف معاملے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی نافرمانی نہیں کریں گے"۔

یہ لوگ فارغ ہوکر اٹھے تو پیغمبر خدا نے مصعب ابن عمیر بن ہاشم کو مدینہ میں فریضۂ دعوت کی انجام دہی پر مامور کیا۔ ان کے ذمہ لگایا کہ وہاں جاکر لوگوں کو قرآن پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں، دین کی سوجھ بوجھ پیدا کریں۔ چنانچہ وہ نماز کی امامت بھی کرتے تھے اور اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کے اصول اخلاق کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ (سیرت ابن ہشام، جلد۲، ص۷۶۔۷۳)

دو لیڈروں کا قبول اسلام

ایک دن اسعد بن زرارہ (جن کے مکان پر نبی اکرم کے مامور کردہ داعی مصعبؓ اقامت گزیں تھے) دعوتی مہم کے سلسلے میں اپنے ساتھ مصعب بن عمیر کو لے کر بنی عبدالاشہل اور بنی ظفر کے گھروں تک جانے کے لئے نکلے۔ دونوں مرق نامی

کنوئیں سے متصل بنی ظفر کے احاطے میں پہنچے۔ بعض لوگ جو
اسلام لا چکے تھے ان کے گرد آ جمع ہوئے۔ سعد بن معاذ اور اسید
بن حضیر دونوں بنی عبد الاشہل کے لیڈر تھے اور ابھی تک اپنی قوم
کے مسلک مشرکانہ پر قائم تھے۔ اسعد بن زرارہ اور مصعب کے
کار دعوت پر سعد بن معاذ جلا بھنا تو تھا ہی، جونہی دونوں
صاحبوں کے ادھر آنے کی اطلاع ملی۔ اس نے اسید کے کان
میں پھونکا کہ یہ دونوں ہم میں سے کمزور افراد کو الو بناتے ہیں۔
لہذا جا کر ان کی خبر لو اور ان کو منع کر دو کہ ہمارے گھروں میں نہ آیا
کریں۔ اگر اسعد بن زرارہ میرا خالہ زاد اور عزیز نہ ہوتا تو
تمہارے بجائے میں خود اس سے نمٹ لیتا۔ چنانچہ جونہی مدینہ
کے حلقہ اسلامی کی یہ مجلس لگی سعد بن معاذ کی تلقین کے زیر اثر
اسید بن حضیر آیا اور بھالا تانے ہوئے ان دونوں داعیان اسلامی
کی طرف لپکا۔ پھر ٹھٹک کر بد زبانی کرتے ہوئے کہا کہ
"ہمارے یہاں آنے کا مطلب کیا ہے؟ تم ہمارے کمزور

آدمیوں کو بیوقوف بناتے ہو، اگر تمہیں اپنی جانوں کی ضرورت

ہے تو ہم سے کنارہ کرو"۔ مصعب نرمی سے کہنے لگے کہ کیا تم ذرا

بیٹھ نہیں جاتے کہ پہلے غور سے سنو پھر اگر بات پسند آئے تو مانو،

ناپسند ہو تو اس سے باز رہو"۔ چنانچہ وہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بھالا

نیچے ڈالا دیا اور تحریک اسلامی کے دونوں داعیون کے پاس

سکون سے بیٹھ گیا"۔ مصعب نے گفتگو شروع کی اور قرآن پڑھ

کر سنایا۔ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ کہ انہوں نے اپنے

مخاطب کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبول اسلام کا

جذبہ پڑھ لیا۔ آخر اسید کی زبان کھلی: "کیا ہی خوب ہے یہ کلام

۔ بہت ہی پیارا!" پوچھا "تم لوگ اسلام میں داخل ہوتے وقت

کیا صورت اختیار کرتے ہو"؟ دونوں نے کہا جاؤ، جاکر نہاؤ،

پاک صاف ہو جاؤ اور اپنے کپڑے دھو ڈالو۔ پھر حق کی صداقت

کی گواہی دو اور نماز ادا کرو۔ اسید جو ابھی بھالا تانے کھڑا

تھا، اب خود اسلام کا زندگی بخش بھالا اس کے سینے میں اتر چکا

تھا۔ اٹھا، نہایا دھویا اور آکر دو رکعتیں نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ

ہو کر بات چھڑی اور اسید نے کہا کہ میرے ساتھ کا ایک شخص اور

ہے اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ہو جائے تو پھر اس کے قبیلے کا کوئی

آدمی سرتابی نہ کرے گا۔ میں اسی وقت اس کو بلا لیتا ہوں۔ وہ

ہے سعد بن معاذ۔ چنانچہ وہ فوراً بھالا اٹھائے سعد کے ہاں

پہنچا۔ وہاں مجلس لگی تھی، اس نے دیکھتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسید کا چہرہ وہ نہیں ہے جو تم

لوگوں سے اٹھ کر جاتے وقت تھا۔ پھر سعد نے اسید سے پوچھا

"کہو کیا کر کے آئے"؟ اسید نے بے ساختہ جواب دیا "میں نے

دونوں سے بات کی، سو خدا کی قسم! ان کی طرف سے کسی طرح کا

اندیشہ محسوس نہیں کیا اور انہیں میں نے منع کر دیا ہے اس پر انہوں

نے کہا کہ ہم وہی کریں گے جو تمہیں پسند ہے۔ ساتھ ہی

ساتھ سعد بن معاذ کے جذبات کو حرکت میں لانے کے لئے یہ

بھی کہہ دیا کہ بنی حارثہ اسعد بن زرارہ کے قتل کے درپے ہیں

اور وہ لوگ یہ جانتے ہوں نے اس بات کی جسارت کر رہے ہیں

کہ اسعد تمہارا عزیز ہے اور اس طرح وہ تمہاری تحقیر کرنا چاہتے

ہیں۔ سعد بن معاذ بنی حارثہ کی طرف سے ایسی حرکت کا خوف

محسوس کرتے ہوئے غضبناک ہوکر لپکا اور بھالا اسید کے ہاتھ

سے اڑس لیا لیکن وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اسلام کے دونوں علم

بردار سکون سے ہیں۔ سمجھ گیا کہ اسید کا منشا اس چال سے صرف

یہ ہے کہ میں براہ راست ان کی بات سنوں۔ ان کو برا بھلا کہتے

ہوئے وہ سامنے ٹھٹک گیا اور اسعد بن زرارہ کو مخاطب کرکے کہا

کہ تم لوگ ہمارے پاس آتے ہو تو ایسی بات لے کر ہمارے

گھروں میں آگئے ہو جس سے ہمیں نفرت ہے۔ مصعب نے

نرمی سے اسی انداز سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ذرا سنبھلو، بات

سنو، پسند ہو تو مانو نہیں تو پھر ہم وہ چیز تمہارے سامنے نہیں لائیں

گے جس سے تمہیں نفرت ہو۔ سعد بن معاذ کہنے لگا...... "تم نے

بات انصاف کی کہی"۔ معا وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بھالا نیچے ڈال دیا اور

بیٹھ گیا۔ سنانے والے نے حق کا پیغام سنایا اور قرآن پڑھا۔ دوبارہ وہی کیفیت پیش آئی۔ سعد بن معاذ کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبول اسلام کا جذبہ جھلکنے لگا۔ یہ دوسرا لیڈر بھی چند لمحوں میں اسلام کے محاذ پر کھڑا تھا۔

سعد "حیات نو" لے کر پلٹے تو اہل مجلس نے دور سے دیکھتے ہی آپس میں کہا کہ چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ آتے ہی اس نے یوں خطاب کیا: "اے عبدالاشہل! میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے"؟ سب کہنے لگے کہ تم ہمارے سردار ہو۔ تمہاری رائے ہم سے پختہ ہے۔ خوبیوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ بابرکت ہو۔ سعد بن معاذ نے کہا"۔ تو پھر جب تک تم لوگ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارے مردوں اور عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام!"...... پھر کیا تھا پورے قبیلے کے مرد وزن میں سے کوئی ایک بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہ رہا۔

ان دو لیڈروں کے ذریعہ جب تحریک حق کی طاقت یکایک اتنی بڑھ گئی تو دعوت کی مہم نے بھی زور پکڑا اور ایک ایک گھر میں صبح اسلام کی تجلیاں بکھر گئیں۔ (حالات کی تفصیل سیرت ابن ہشام، جلد ۲، ص ۸۷-۷۷ سے لی گئی ہے)۔

بیعت عقبہ ثانیہ

اسی دوران میں حج کا زمانہ آ گیا۔ اب کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مکہ پہنچی۔ مدینہ کی زمین خوب فصل دے رہی تھی۔ یہ نئے جذبۂ دینی سے سرشار ہو کر آنے والے حجاج قریش سے بچ بچ کر راتوں کی تاریکی میں اپنے قائد محبوب سے ملے۔ اس بار پھر عہد وفا از سر نو استوار کیا گیا۔ لیکن اب کی معاملہ "بیعت النساء" سے بہت آگے تک جا پہنچا۔ پہلی بیعت میں سیاسی پہلو صرف ایک نکتے سے نمایاں ہوتا تھا۔ یعنی یہ اقرار کہ ہم "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف احکام سے سرتابی نہیں

کریں گے"۔ لیکن اس مرتبہ سیاسی پہلو پوری خطرناکیوں کے

ساتھ سامنے آ گیا۔ اب محمدؐ کا ساتھ دینے کے معنی قریش اور

سارے عرب کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کے تھے اور یہی معنی

سامنے رکھ کر بیعت ثانیہ استوار کی گئی۔ گفتگو میں تحریک اسلامی

کے ان یثربی سپاہیوں نے پیش آئند ممکنات کا پورا اندازہ کر کے

کہا، کہ لوگوں (یعنی یہود) کے ساتھ ہمارے معاہد اند روابط ہیں

اور ہمیں ان روابط کو توڑنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم یہ کر

چکیں اور پھر اللہ تعالیٰ آپؐ کو غلبہ عطا کر دے تو آپؐ اپنے

خاندان والوں کی طرف لوٹ جائیں۔ اور ہمیں چھوڑ دیں"۔

اس اندیشے کے جواب میں مسکراتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا

"تمہارا خون میرا خون ہے، تمہارے دشمن میرے دشمن، میں

تمہارا اور تم میرے! جس سے تمہاری جنگ اس سے میری

جنگ، جس سے تمہاری صلح اس سے میری صلح"۔ عباس بن عبادہ

نے کہا: "اے خزرج والو! جانتے ہو کہ اس ہستی کے ساتھ کس

بات کا پیمان باندھ رہے ہو؟...... یہ لوگوں میں سے سرخ و سیاہ سے جنگ کا پیمان ہے''۔ اہل وفد نے پوری ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا کہ ''ہاں ہم اپنے مالوں کی تباہی، اپنے سرداروں کے قتل کے علی الرغم آپؐ کے ساتھ پیمان باندھ رہے ہیں''۔ اس بیعت کی خاص نوعیت ہی کی وجہ سے اس کا نام ''بیعت حرب'' پڑ گیا۔ اس بیعت کی ایک مرکزی شرط یہ تھی۔ کہ ''ہم تنگی میں اور آسانی میں، خوشی میں اور رنج میں آنحضورؐ کا ہر ارشاد سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے اور حضورؐ کو اور حضورؐ کے فرمان کو اپنے آپ پر ترجیح دیں گے اور یہ کہ ہم ارباب امر سے کشمکش نہیں کریں گے اور یہ کہ ہم اللہ کے دین کے معاملے میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے''۔

یہ بیعت گویا اسلامی قصر ریاست کی پہلی اینٹ تھی اور ساتھ کے ساتھ کتاب تحریک میں لکھے جانے والے باب ہجرت

کا دیباچہ! اس بیعت کے ذریعے مستقبل کی اسلامی ریاست کے لئے گویا اس کے ہونے والے شہریوں نے برضا اور رغبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو قبول کر لیا۔ علاوہ ازیں سمع وطاعت کا نظم استوار ہو گیا۔

اس موقع پر صرف ایک پیمان ہی نہیں باندھا گیا بلکہ اجتماعی نظم کی بنیاد بھی رکھ دی گئی۔ اسلامی تحریک کے قافلہ سالار نے شہری جماعت کی رائے سے بارہ نقیب مقرر کئے۔ نو خزرج میں سے، تین اوس میں سے! ان نقیبوں کو مامور کیا گیا کہ تم اپنی قوم کے سارے معاملات کے ذمہ دار ہو بالکل اسی طرح جیسے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے حواری ذمہ دار تھے اور جیسے خود میں اپنی پوری جماعت کا ذمہ دار ہوں۔ یہ گویا آنحضورؐ کے نائب تھے۔ ان کے تقرر سے منظم معاشرہ کی تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔

قریش کے کان میں بھنک پڑی تو سٹپٹا گئے۔ وفد جا چکا تھا اس لئے تعاقب کیا اور سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو کو گرفتار کر لائے۔ ان پر انہوں نے اپنا غصہ نکالا لیکن سانپ نکل گیا تھا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام، جلد ۲، ص ۹۴۔۸۱)

مدینہ میں تحریک کا نیا دور

یہ طاقت مکہ سے نئی اسپرٹ لے کر مدینہ پلٹی تو دعوت کا کام علی الاعلان بہت ہی زور شور سے شروع ہو گیا۔ نوجوان جب کسی تبدیلی کے نقیب بن کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے مقابلے میں بڑھاپے سے گذرتی ہوئی نسل دیر تک جم نہیں سکتی اور جمے بھی تو اس کا دور زیادہ لمبا نہیں ہو سکتا اور کسی تحریک کے مستقبل کا اندازہ کرنے کے لئے یہ جاننا بہت مفید ہوتا ہے کہ وہ میدان چھوڑتی ہوئی سال خوردہ نسل کے بل بوتے پر چل رہی

ہے یا اس کی رگوں میں نیا خون رواں ہے۔ سو مکہ میں بھی اور خاص طور پر مدینہ میں نوجوان طاقت دعوت اسلامی کے جھنڈے اٹھائے آگے آگے بڑھ رہی تھی۔

نوجوان طاقت نے کیا کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بڑے بوڑھوں میں سے ایک بزرگ تھے عمرو بن الجموح جن کا تعلق بنی سلمہ سے تھا، ان بڑے میاں نے اپنے گھر میں لکڑی کا بت مناۃ نامی فراہم کر رکھا تھا۔ یہ اس کی پوجا کرتے تھے اور اس کی جھاڑ پونچھ میں لگے رہتے تھے۔ بنی سلمہ کے دو نوجوان معاذ بن جبل اور معاذ بن عمرو دعوت حق پر ایمان لاکر تحریک اسلامی کے کارکن بن چکے تھے۔ مؤخر الذکر خود انہی بڑے میاں کے صاحبزادے تھے۔ یہ دونوں رات کی تاریکی

میں جاتے اور بڑے میاں کے خداوند کو کیچڑ میں لت پت

کر دیتے اور اٹھا کر بنی سلمہ کے گڑھے میں الٹا کر کے ڈال آتے

جہاں لوگ غلاظت اور کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے۔ صبح ہوتی تو عمرو

بن الجموح چلاتا کہ یہ کون ہے جس نے رات ہمارے خدا

وندوں پر دراز دستی کی ہے؟ ” پھر وہ اپنے خدائے گم شدہ کو

ڈھونڈتا پھرتا اور جب پالیتا تو اسے دھو دھا کر سنگھاسن پر

لا بٹھاتا۔ اگلی رات پھر یہی حادثہ پیش آتا۔ بڑے میاں پھر اسی

چکر میں بڑبڑاتے پھرتے۔ ایک دن عمرو نے تنگ آکر اپنی تلوار

بت کے ساتھ لٹکا دی اور اسے خطاب کر کے کہا کہ ” خدا کی قسم

میں نہیں جانتا کہ کون تیرے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے۔ سو اگر تجھ

میں کس بل ہے تو پھر خود ہی اپنا بچاؤ کر۔ یہ تلوار موجود ہے “۔

شام ہوئی اور عمرو سو گیا تو اس ڈرامے کے دونوں کردار رات کو

آئے اور تلوار بت کی گردن سے کھول لی۔ پھر ایک مرا ہوا کتا

تلاش کر کے اس کے گلے میں رسی سے باندھا اور اسے ایک

اندھے کنوئیں میں جا کر ڈال آئے جو انسانی غلاظت سے اٹا رہتا تھا۔ صبح اٹھ کر عمرو نے دیکھا تو حضرت پھر غائب تھے۔ تلاش کی تو یہ حال زار دیکھا۔ عبرت کا یہ نقشہ دیکھتے ہی دل نے کروٹ لی اور وہی عمرو اسلام کی صفوں میں آ شریک ہوئے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ کی کس طرح کایا پلٹ رہی تھی۔

تحریک کا نیا مرکز

تحریک حق کا آسمانی لیڈر برابر سوچ میں رہا کہ اگر مکہ کے ظرف میں سمائی نہیں اور یہاں کی سنگین قیادت "جہان نو" کی تاسیس کا موقع دینے پر تیار نہیں ہے تو پھر زمین کا اور کونسا گوشہ ہو سکتا ہے جہاں طاقت کو سمیٹ کر تعمیری کام کیا جا سکے۔ پہلے نگاہ حبش پر گئی اور اسی لئے ساتھیوں کو وہاں بھیجا۔ اگرچہ شاہ نجاشی نے مظلومین مکہ کی حمایت کا حق ادا کر دیا۔ لیکن ایک تو

وہاں عیسائی علماء کا گھٹیا کردار سامنے آچکا تھا اور ان کے چھائے

ہوئے اثر کے تحت دین حق کا پنپنا آسان نہ تھا۔ دوسرے وہاں

کی مقامی آبادی میں بالکل نئے سرے سے کام کرنے کی

ضرورت تھی اور اس نے اجنبیت کے بہت سے وجوہ حائل نظر

آتے تھے۔ اس لئے کسی دوسرے گوشے کی تلاش تھی۔ مدینہ

نے جب کھلے دل سے دعوت حق کو لبیک کہی تو سرورِ عالم کو امید

کی ایک نئی جھلک نظر آئی۔ بیعت عقبہ اولیٰ نے اس امید کو مستحکم

تر کر دیا۔ پھر مصعبؓ بن عمیر نے خود وہاں رہ کر اور کچھ عرصہ کام

کرنے کے بعد بیعت عقبہ ثانیہ والے موسم حج سے کچھ قبل آ کر

حضور کی خدمت میں رپورٹ پیش کی۔ مدینہ کے مسلمانوں کی

تفصیل بیان کی، ان کی قوت کا حال بتایا اور خوشخبری دی کہ وہ

امسال بڑی تعداد میں آ رہے ہیں۔ اس رپورٹ نے حضور کو غور

وفکر کی دعوت دی۔ یہ صورت فی الواقع بڑی خوش آئند تھی کہ

مدینہ کے مسلمان تعداد اور قوت کے لحاظ سے دن بدن بڑھ

رہے تھے اور پھر یہود کی طرف سے اس طرح کی سنگین مخالفت کا
ان کو سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا، جیسے ان کے مکی ساتھیوں کو قریش
کی طرف سے درپیش تھی۔ اور اہل یثرب مکہ والے رفقاء کے
لئے بالعموم کڑھتے تھے۔ ان کو بہت زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔
ان کے ہاں کھیتیاں تھیں اور نخلستان اور تاکستان تھے۔ حضورؐ
سوچتے تھے کہ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ مکہ کے رفقاء مدینہ چلے جائیں
اور قریش کے مظالم سے نجات پا کر دین کے تقاضے پورے
کریں۔ چنانچہ آنے والے وفد میں جو لوگ محرم تھے ان سے
آپؐ نے اس خیال کا اظہار بھی فرما دیا اور بعد میں جس شکل میں
پیمان باندھا گیا وہ اسی پس منظر کے ساتھ تھا۔ (تفصیل کے
لئے ملاحظہ ہو: حیات محمدؐ از محمد حسین ہیکل مصری، ص ۲۰۲-۲۰۳)

یوں تو ہجرت حبشہ سے مہاجرین کے لوٹ آنے کے
بعد ہی اکا دکا رفقاء آپؐ کی اجازت سے مدینہ جاتے رہے لیکن
بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد رفتار تیز ہو گئی اور تقریباً طے ہو گیا کہ

دوسرا اوراہل ہجرت مدینہ ہی ہوگا۔

سرداران مکہ دیکھ رہے تھے کہ تحریک اسلامی نے ایک نیا مضبوط مرکز پیدا کرلیا ہے۔ ان کی نگاہوں میں مستقبل بڑا بھیانک ہو ہو کر آنے لگا۔ وہ اپنی جگہ خوب سمجھ رہے تھے کہ اب اگر مدینہ میں کلمہ حق کی جڑ لگ جاتی ہے تو ہمارے حدود اثر سے باہر ہی باہر یہ کلمہ ایک ناقابل شکست طاقت بن کر ایک دن ہماری ہی خبر لے گا اور ہمیں کو اپنے کرتوتوں کا حساب پائی پائی ادا کرنا ہوگا۔ وہ اس خطرے کو بھی محسوس کر رہے تھے کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گذرتی ہے۔ اس لئے مدینہ کا نیا اسلامی مرکز شاہراہ کی ناکہ بندی کر سکے گا اور اس طرح ان کی معاشی شاہ رگ کٹ جائے گی۔ ان پر اندر ہی اندر گھبراہٹ کا شدید دورہ پڑ چکا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کریں کیا؟ وہ دن رات اس اندیشے میں رہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پوری جماعت کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اسی اندیشہ کے زیر

اثر وہ بالآخر صاحب نبوت کے قتل کے منصوبے بنانے پر اتر آئے۔ ایک تاریخی طاقت جوان کے اپنے گھر سے ابھری اور ساری دنیا سے زیادہ وہ ان کی اپنی تھی۔ اسے اپنے ہی کرتوتوں سے "غیر" بنادیا اور خود اس کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب جوں جوں وہ زور پکڑتی تھی، ان کے لئے ایک جان لیوا خطرہ بنتی جاتی تھی۔

چنانچہ پہلا مہاجر جب مدینہ کے ارادے سے نکلا تو مکہ والوں نے اس کے ساتھ جفا کارانہ معاملہ کیا۔ یہ اولین مہاجر ابو سلمہ عبداللہ بن الاسد مخزومی تھے۔ یہ بیوی بچے کو اونٹ پر سوار کر کے نکلے۔ ان کی بیوی بنو مغیرہ میں سے تھیں، وہ لوگ عین روانگی کے وقت تندی میں آئے اور ام سلمہؓ کے اونٹ کی مہار یہ کہہ کر ابو سلمہؓ سے چھین لی کہ اسے ہم تیرے ساتھ در در پھرنے کے لئے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس جذباتی صورت حالات نے ابو سلمہؓ کے قبیلہ والوں میں سخت ردعمل پیدا کر دیا۔ انہوں نے بنو

مغیرہ سے کہا کہ اگر تم ہمارے آدمی سے اس کی جورو کو یوں چھینتے ہو تو پھر اپنا ننھا بچہ اس کی گود میں نہ رہنے دیں گے۔ چنانچہ شوہر بیوی اور بچہ تینوں باہم دیگر بچھڑ گئے اور اس عالم میں ابو سلمہؓ نے کوچ کیا۔ ام سلمہؓ صبح کو آکر شہر سے باہر اسی موقع پر زار و قطار رونے لگتیں۔ آخر سال بھر کے بعد کسی کو رحم آ گیا اور اس نے بنو مغیرہ سے کہہ سن کر اونٹ پر سوار کرا کے ام سلمہؓ کو بچہ سمیت مدینہ روانہ کر دیا۔ اور وہ تن تنہا چل کھڑی ہوئیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک مقام پر عثمان بن طلحہؓ مل گئے اور انہوں نے اس مہاجرہ کو حوالی مدینہ میں پہنچا دیا۔

یعنی ہجرت حبشہ کے تلخ تجربے کے بعد اب پالیسی یہ ٹھہری کہ خدا پرستانہ نظام زندگی کے علمبرداروں کو اپنے قابو سے نکلتے ہوئے روکا جائے۔ وہ نکلیں تو ایسی حالت میں نکلیں کہ ان کا کنبہ قبیلہ بطور یرغمال مکہ والوں کے پاس رہے۔ یہ پالیسی شروع میں ذرا ڈھیلی ڈھالی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں سختی بڑھتی گئی۔ حتی

کہ حضرت عمرؓ اور عیاشؓ ابن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص ابن
الوائل دور آخر میں ایسے عالم میں چھپ چھپا کر نکلے کہ ہر وقت
دھڑ کا تھا کہ کہیں گرفتار نہ ہو جائیں۔ حضرت عمر اور عیاشؓ تو تیز
رفتاری سے نکل گئے، لیکن ہشام کو پکڑ لیا گیا اور وہ شکنجہ استبداد
میں آ گئے۔ حضرت عمر اور عیاشؓ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ مکہ سے
ایک سازشی وفد ان کے پیچھے روانہ ہوا جو ابوجہل بن ہشام اور
حارث بن ہشام پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ جا کر عیاشؓ سے ملے اور
کہا کہ تمہاری والدہ کا حال ابتر ہے اور اس نے قسم کھائی ہے کہ
جب تک تم سے نہ ملے گی سر کے بال نہ سنوارے گی اور چلچلاتی
دھوپ میں کھڑی رہے گی۔ ساتھیوں نے سمجھایا کہ یہ واضح
طور پر ایک چال ہے تو ایک بار مکہ والوں کے پھندے میں پھنس
گئے تو تمہیں دین سے ہٹا دیں گے۔ عیاشؓ کو ایک لالچ یہ بھی تھا
کہ وہ مال دار آدمی تھے اور کچھ مال نکال لانا چاہتے تھے۔
حضرت عمرؓ نے پیش کش کی کہ میں اس سے زیادہ مال رکھتا

ہوں۔ تم مجھ سے آدھا مال لے لو۔ ان کے ساتھ نہ جاؤ۔ عیاشؓ

نہ مانے، تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اچھا اگر یہی طے ہے تو میری

اصیل اونٹنی لے جاؤ۔ جہاں کوئی اندیشہ محسوس ہو بھاگ نکلنا۔

مگر کی سازشیوں نے راستے میں ایسی چال چلی کہ اصیل اونٹنی

سے فائدہ اٹھانا بھی عیاشؓ کے بس کا نہ رہا اور ان کی مشکیں کس

لی گئیں۔ اہل وفد جب مکہ پہنچے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ

دیکھو، یوں علاج کرو، اپنے اپنے عقل کے ماروں کا جیسے ہم نے

کیا ہے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے دست خاص سے ایک خط ہشام

بن العاص کو لکھا اور اس میں مشہور آیت "یعبادی الذین

اسرفوا ...... الخ" درج کی۔ اس خط کو مکہ کے پاس "ذی

طویٰ" نامی موقع پر ہشام نے پڑھا۔ بار بار غور کیا اور جب بات

پالی کہ اس میں اشارہ خود اس کی جانب ہے تو فوراً اونٹ لیا کجاوا

کسا اور روانہ ہو گیا لیکن اس سے زیادہ مضبوط روایت یہ ہے کہ

جب آنحضور صلعم مدینہ تشریف لا چکے تو ایک دن مجلس میں ان دونوں محبوسین کا ذکر چھڑا۔ آپ ؐ نے فرمایا "عیاشؓ بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص کو نجات دلانے کے لئے کون مجھے اپنی خدمات سونپتا ہے؟" ولید بن مغیرہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ولید حکم نبوی ؐ کے مطابق مکہ روانہ ہو گئے۔ چھپتے چھپاتے آبادی کے قریب آئے۔ ایک عورت کھانا لے جاتی نظر آئی۔ پوچھا۔ "اللہ کی بندی کدھر کو جاری ہو"؟ اس نے جواب دیا کہ "یہاں دو قیدی ہیں، یہ کھانا ان کے لئے ہے"۔ ولید پیچھے ہوئے۔ وہی دونوں تھے۔ اور ایک بے چھت کے مکان میں بند تھے۔ شام ہو گئی تو دیوار پھاند کر اترے، ان کی بیڑیوں کے نیچے پتھر رکھ کر اپنی تلوار سے ان کو کاٹ ڈالا۔ پھر باہر نکال کر دونوں کو اونٹ پر بٹھایا اور راہ فرار اختیار کی۔

اسی طرح اکثر لوگ خود اگر نکلے بھی تو مکہ والوں نے ان سے ان کے اموال رکھوا لئے۔ جیسے بھارت سے جانیں بچا کر

نکلنے والے بہت سے مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔

لیکن ہجرت کے اس درجہ جگر آزما ہونے کے باوجود مرد ہی نہیں، خواتین بھی برابر جادۂ فرض پر چل رہی تھیں۔ تحریک اسلامی کا یہ اعجاز اپنی مثال نہیں رکھتا کہ آج سے صدیوں پہلے کے وحشی عرب کی ان پڑھ خواتین تک میں اس زندگی بخش طاقت نے ایک زوردار حرکت عمل پیدا کر دی۔

مہاجرین کے راستے میں رکاوٹیں ڈال کر قریش اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر دوسری طرف جس شخصیت سے سابقہ تھا وہ عالی حوصلگی کی اونچی چوٹی پر کھڑی تھی۔ وہاں سمندر کا سا وسیع ظرف تھا۔ وہ پیکر صبر واستقلال ٹھنڈی عزیمت اور ٹھہراؤ والی فطرت سے آراستہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مرکز دعوت پر ڈٹا رہا۔ اسے آخری حد تک اتمام حجت کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ وہ اہل مکہ کے خلاف مشیت الٰہی کے کھیل کو تکمیل تک پہنچانے

کے لئے اپنا فرض صبر و تحمل سے ادا کر رہا تھا۔ اس کی مثال ڈوبتے جہاز کے بہادر کپتان کی سی تھی جو سارے عملے اور سارے مسافروں کو سلامتی کی کشتی پر سوار کرنے کے بعد سب سے آخر میں جہاز کو چھوڑنے والا تھا۔

جب بجز ایسے چند افراد کے کوئی باقی نہ رہا جنہیں قریش کے جبر نے محصور کر رکھا تھا یا جن کو کسی مفاد یا مصلحت نے باندھ رکھا تھا تو اس وقت آپ کو آسمانی حکومت کی طرف سے پروانۂ ہجرت ملا۔ آپ نکلے تو ایسے عالم میں جبکہ مکہ والے آپ کو زندہ دیکھنے کے روادار نہ رہے تھے اور جب نکلنے کی گھڑی آ گئی تو خون کی پیاسی تلواروں کے گھیرے میں سے آپ بے خوفی کی شان سے نکل گئے۔

مدینہ ...... ہمہ تن انتظار

مہاجرین کی تعداد جوں جوں بڑھ رہی تھی مدینہ میں زندگی کی رو زور پکڑ رہی تھی۔ دعوت حق کا اجالا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا اور جتنا جتنا اسلام دلوں کی دنیاؤں کو فتح کرتا جاتا تھا۔ اسلام کا پیغام لانے والے محسنؐ کی چاہت بڑھتی جاتی تھی۔ خصوصاً بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد سے مدینہ کی چشم انتظار ہر دم مکہ سے آنے والے راستہ پر لگی رہنے لگی۔ ایک فصل لہلہا رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ ابر کرم آئے اور برس جائے۔ ایک چمن لالہ و گل آراستہ تھا اور امیدوار تھا کہ باد بہاری کے جھونکے آئیں اور رنگ و بو کے طوفان اٹھ پڑیں۔ مسالہ جمع پڑا تھا اور ہمہ تن آرزو تھا کہ معمار انسانیت آئے اور تعمیر نو بپا کر دے۔

ہوا کی لہریں یہ اطلاع بھی کسی نہ کسی طرح لے آئیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے نکل چکے ہیں اور جادہ ہجرت

کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اس خبر پر مدینہ میں اشتیاق کے جذبات اضطراب کی حد کو پہنچ گئے ہوں گے۔ انتظار کی بے چینیاں زور پکڑ گئی ہوں گی۔ سوچو کہ ہر طرف کیا چرچے ہوں گے؟ کیا استفسارات ہوا کرتے ہوں گے؟ کیسی گفتگو میں محفلوں کی رونق رہتی ہوں گی؟ جذبات واحساسات کا کیا عالم ہوگا؟ مشرکین کا، یہود کا، انصار کا، مسلمانوں کا۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبانوں پر یہی بات رہنے لگی کہ رسول آ رہے ہیں، رسول آ رہے ہیں۔ لوگ ہر صبح گھروں سے نکلتے اور شہر سے باہر جمع ہو کر انتظار کرتے۔ جب گرما کا سورج اونچا ہو جاتا اور دھوپ قابل برداشت نہ رہتی تو حسرت زدہ ہو کر لوٹ جاتے۔ یوم قدومت کو بھی لوگ اسی طرح جمع ہو کر لوٹ رہے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے پر سے دیکھا اور مژدہ سنایا کہ "اہل یثرب! لو تمہیں جس بزرگ کا انتظار تھا وہ آ پہنچے"۔ تمام شہر تکبیر کے غلغلے سے گونج اٹھا۔ لوگ بیتابانہ

دوڑے اکثر انصار خوب ہتھیار سجا کر نکلے۔

اولین قیام مقام قبا میں ہوا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی آبادی تھی۔ عمرو بن عوف کے خاندان نے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ استقبال کیا اور اسی خاندان کو شرف میزبانی حاصل ہوا۔ یہ گھر دراصل تحریک اسلامی کا ایک مرکزی اڈہ (Cell) تھا۔ مہاجرین میں اکثر کے لئے منزل اول یہی گھر بنا اور بعض مہاجر صحابی اس وقت بھی یہیں مقیم تھے۔ حضرت علیؓ بھی امانتوں کی ادائی کے بعد روانہ ہو کر یہیں کاروان محبوب کے ساتھ آملے۔ یہاں چودہ روز قیام کیا۔ مہاجرین اور انصار جوق در جوق شرف ملاقات حاصل کرنے کو آرہے تھے لوگ اس ہستی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کا پیغام ان کے سینوں میں گھر کر چکا تھا۔ اس کے چہرے کی ایک جھلک نگاہوں کے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اس کے منہ سے میٹھے بول سننا چاہتے تھے۔ اس کی دعائے خیر سے حصہ حاصل کرنا چاہتے

تھے۔ غائبانہ عقیدت اب محسنِ انسانیت کو رو در رو دیکھنا چاہتی تھی۔ سلام، ملاقاتیں، گفتگوئیں، دعائیں، مجلسیں، کیا پوچھنا ہوگا۔

قبا میں آپ نے اپنے ہاتھوں سے ایک مسجد کی بنا رکھی۔ ایک ایک مسلمان اس تعمیر کی مہم میں شریک تھا اور خود دنیا کا سب سے بڑا تاریخ ساز ایک معمولی مزدور کی طرح بھاری بھرکم پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا۔ کام ہو رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ گیت گایا جا رہا تھا:

افلح من یعالج المساجدا ویقرء القرآن قائماً وقاعداً

ولا یبیت اللیل عنہ راقداً

یعنی کامیاب وہ ہے جو مسجد یں تعمیر کرے۔ اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور راتوں کو (عبادت کے لئے) جاگے۔ یہ مسجد محض اینٹ پتھر اور گارے اور پھوس کا مجموعہ نہ تھی۔ اس میں

خاتم النبیین سے لے کر ایک عامی مسلمان تک ہر ایک نے بہترین جذبات صرف کیے تھے۔ اسی لئے اس کی شان میں قرآن نے کہا۔ "لمسجد اسس علی التقوی" یہ ایک مسجد ہے کہ اس کی بنیاد تقوی پر استوار کی گئی ہے۔

قبا میں ورود ۸ ربیع الاول سن ۱۱ (نبوی) بروز جمعرات ہوا۔ چودہ روز بعد انسان اعظمؐ نے رفقاء سمیت مدینہ کا رخ کیا۔ قبا سے مدینہ تک دورویہ انصار خیر مقدم کے لئے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ آپؐ کے ننھیالی رشتہ داروں نے خاص اشتیاق سے ہتھیار سجائے۔ عورتیں چھتوں پر جمع تھیں اور ترانۂ خیر مقدم گا رہی تھیں۔

طلع البدر علینا | من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا | ما دعا للہ داع

اور چھوٹی بچیوں کے غول گھوم رہے تھے۔ یہ لڑکیاں دف

بجا بجا کر گاتی پھرتی تھیں۔

نحن جوار من بنی نجار یا حبذا محمداً من جار

ان بچیوں کی پاکیزہ محبت کا جواب سرورِ عالمؐ نے بھی خاص شفقت سے دیا۔ ان سے باتیں کیں۔ پوچھا کہ "کیا تم مجھے چاہتی ہو"؟ انہوں نے کہا۔ "جی ہاں!" آپؐ نے فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں" (سیرت النبیؐ، جلد ۱۔ ص ۲۰۲۔۲۰۳)

ذرا تصور میں لائیے ان تاریخی گھڑی کو جو مدینہ کے نصیب میں آئی تھی۔ گلیوں کی خاک کے ذرے ذرے میں دل دھڑک رہے ہوں گے۔ دیواروں کی درزوں کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ ہوا کے جھونکوں میں انسانی احساسات پیدا ہو گئے ہوں گے۔

عارضی قیام کے لئے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر

کی قسمت جاگی۔ سات ماہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیام یہیں رہا۔

تعمیری اقدامات

جونہی ذرا سکون ہوا اور مسافرت کی کیفیت ختم ہوئی تو سرور عالم تعمیری اقدامات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اولین مہم مسجد کی تعمیر کی تھی۔ دو یتیم بچوں کی افتادہ زمین خریدی گئی اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہی نے قیمت ادا کی۔ اس زمین پر مسجد نبوی کی تاسیس ہوئی۔ مسجد کی اہمیت صرف بطور معبد ہی کے نہ تھی۔ بلکہ اسے اسلامی نظام تمدن و ریاست کا سرچشمہ و مرکز بننا تھا۔ وہ حکومت کا دربار، مشورے کا ایوان، سرکاری مہمان خانہ، جمہوری دارالعلوم اور قومی کلچر ہال کی حیثیت سے برپا کی گئی۔ اس اولین تعمیری اقدام پر وہی قبا والا نقشہ پیش آیا۔ کون مسلمان ہوگا جس نے اس میں دل و جان سے حصہ نہ لیا ہوگا۔ خود سرور عالم

پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لاتے اس منظر کو دیکھ کر ایک مسلمان مارے جذبات کا پکار اٹھا کہ:

لئن قعدنا والنبی یعمل　　　　لذاک منا العمل المضلل

یعنی اگر خدا کا نبیؐ اس کام میں یوں لگ جائے اور ہم بیٹھے دیکھتے رہیں تو ہمارا کیا کرایا غارت ہوا۔ کام کی گرما گرمی میں کوئی بیہودہ گوئی نہ تھی۔ بلکہ آنحضورؐ سمیت سب کے سب یہ صدا بلند کر رہے تھے۔

لاعیش الا عیش الاخرۃ　　　　اللھم ارحم الانصار والمھاجرہ

یعنی آخرت کی ابدی زندگی ہی زندگی ہے۔ اور وہ نہ ہو تو پھر زندگی ہیچ ہے۔ اے اللہ! "تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما"۔

(سیرت ابن ہشام جلد ۲۔ ص ۵۔۱۱۴)

یہ تھی اسپرٹ اور یہ تھیں دعائیں جو مسجد نبویؐ کی تعمیر کا اصل مسالا بنیں۔ مسجد کے ساتھ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

کے لئے گارے اور پھونس کے حجرے (کوارٹرم) تعمیر ہو گئے۔ آپ اپنے انہی کوارٹرز میں منتقل ہو گئے۔

مدینہ میں حضرت رسالت مآب کی تشریف آوری سے از خود دعوت کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور اس سات ماہ کے عرصہ میں تحریک حق نے قبیلے قبیلے اور گھر گھر سے جاں نثار حاصل کر لئے صرف خطمہ، واقف، وائل اور امیہ کے گھرانوں میں شرک کی تاریکی باقی رہ گئی۔ اور ان سب کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا (سیرت ابن ہشام جلد ۲۔ ص ۱۱۵۔ ۱۱۴)

تعمیری مہم کے سلسلے میں کار دعوت کا آگے بڑھانا درجہ اول کی اہمیت رکھتا تھا۔ انفرادی دعوت کے علاوہ سرور عالم نے اجتماعی طور سے کام کا آغاز جس خطاب عام سے کیا وہ ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

(حمد و ثناء کے بعد)...... لوگو! اپنی جانوں کے لئے وقت پر کچھ

کمائی کرلو، خوب جان لو، خدا کی قسم تم میں سے ہر ایک پر موت
وارد ہوگی اور وہ لپنے گلے کو اس حال میں چھوڑ کر رخصت ہوگا
کہ کوئی اس کا چرواہا نہ رہے گا۔ پھر اسے اس کے پروردگار کی
طرف سے ایسے عالم میں خطاب کیا جائے گا جبکہ بیچ میں کوئی
ترجمان نہ ہوگا۔ کہا جائے گا کہ کیا تجھ تک میرا رسول نہیں پہنچا
تھا۔ جس نے بات تجھ تک پہنچائی ہو۔ پھر کیا میں نے تجھے مال
نہیں دیا تھا اور تجھ پر نوازش نہیں کی تھی؟ تو پھر اپنی جان کے لئے
تو نے کیا اندوختہ کیا؟ پس وہ دیکھے گا دائیں بائیں، لیکن کچھ نہ
دکھائی دے گا۔ پھر سامنے کی طرف نگاہ ڈالے گا مگر بجز جہنم کے
اور کچھ سامنے نہ آئے گا۔ سو جس کو بھی توفیق ہو کہ وہ کھجور کی ایک
پھانک کے عوض بھی اپنے چہرے کو دوزخ کی آگ سے بچانے
کے لئے کچھ کرسکتا ہو تو کرے جو اتنا بھی نہ کرسکے وہ کوئی بھلی
بات کہہ کر ہی بچاؤ کرے۔ کیونکہ نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر
سات سو گنا تک ملتا ہے۔ تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور

بدبختیں وارد ہوں"۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲۔ ص ۱۱۸)

دوسرا خطاب عالم جو آپؐ نے فرمایا، یہ تھا:

"ساری تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں۔ اسی سے مدد چاہتا ہوں! ہم سب اپنے دلوں کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں کے مقابلے میں اللہ ہی کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ ہدایت سے محروم کر دے اس کے لئے کوئی رہنما نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا، جو ایک ہے اور جس کے ساتھ کوئی دوسرا حصہ دار نہیں، کوئی اور قابل عبادت و طاعت ہستی نہیں، بلاشبہ بہترین بیان اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے جس شخص کے دل کے لئے اللہ نے اس کو محبوب بنا دیا اور جسے کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا اور جس نے اور سارے انسانی بیانوں کے مقابلے میں اسے اپنے لئے پسند کر لیا۔ اس نے فلاح پائی۔ یہ بہترین بیان ہے اور سب سے

زیادہ موثر ہے۔ تم وہی کچھ پسند کرو جو اللہ کو پسند ہے اور اللہ سے
اخلاص کے ساتھ محبت کرو۔ اللہ کے کلام سے تغافل نہ برتو اور
تمہارے دل اس کے لئے سخت نہ ہونے پائیں۔ چونکہ یہ
حقیقت یہ ہے کہ اللہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اور اس سے بہتر کو
چھانٹتا اور منتخب کرتا ہے۔ سو اس نے اعمال میں سے بہترین اور
بندوں میں سے برگزیدہ ترین اور بیانوں میں سے پاکیزہ ترین
کو متعین فرما دیا ہے۔ نیز انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے اس سب
میں سے کچھ حلال ہے، کچھ حرام ہے۔ پس اللہ کی غلامی اختیار
کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دو۔ اس کے غضب
سے اس طرح بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے اور اللہ کے حضور میں وہ
سارے پاکیزہ اقوال سچ کر دکھاؤ جن کو تم اپنی زبانوں سے ادا
کرتے ہو اور اللہ کی رحمت کے ذریعے ایک دوسرے سے محبت
کا رشتہ استوار کرو۔ یقیناً اللہ ناراض ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ
باندھے ہوئے (ایمان کے) عہد کو توڑا جائے۔ اور تم پر سلامتی

ہو"۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲۔ ص ۹۔ ۱۱۸)

تقریر کے الفاظ جو روایات میں ملتے ہیں۔ بہت مختصر ہیں اور آنحضرتؐ کے خطاب بالعموم مختصر ہوتے تھے لیکن مطالبہ کی جامعیت دیکھئے کہ وقت کے تمام اہم مسائل ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔ تقریر میں اسلام کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ قرآن کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز پیدا کرنے کا درس دیا گیا ہے اور اصولی و مقصدی جذبۂ اخوت و رفاقت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ان دو تقریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اجتماعی دعوت کی نئی لہر کس انداز سے اٹھائی گئی تھی۔ ایک طرف بنیادی نظریہ کا پیغام دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف اسی نظریہ کی اسپرٹ کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے سوسائٹی کو رہنمائی دی جا رہی تھی۔

اسلامی ریاست کی تاسیس

تیسرا تعمیری اقدام ...... اور شاید سیاسی لحاظ سے سب سے بڑا تعمیری اقدام ...... یہ تھا کہ ریاست چلانے کے لئے مدینہ کے یہود و مشرکین اور مسلمانوں کی سوسائٹی کو ایک نظم میں پرو دیا گیا۔ سیاسی نوعیت کی تنظیم معاشرہ کے لئے ایک تحریری معاہدہ استوار کیا گیا۔ جس کی نوعیت درحقیقت ایک باقاعدہ تحریری دستور کی ہے۔ اس کو بجا طور پر دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں اس دستور کی دفعات پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ اس کے چند اہم پہلوؤں کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں۔ اس دستوری معاہدے کے ذریعہ نبی اکرمؐ نے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا:

...... مدینہ کے منظم ہونے والے معاشرے میں خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کو اساسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

Source: www.prophetmuhammadforall.org 55 :صفحہ نمبر

...... سیاسی، قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار (Authority) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ آ گیا۔

...... وفاقی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی پوری آبادی ایک متحدہ طاقت بن گئی اور اس کے کسی عنصر کے لئے قریش کی حمایت کے دروازے بند ہو گئے۔ نیز وفاقی لحاظ سے بھی مرکزی اور فیصلہ کن اختیار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گیا۔

اس دستوری معاہدہ سے باضابطہ طور پر اسلامی ریاست اور اسلامی نظام حیات کی تاسیس واقع ہو گئی۔ (جو طاقت کوئی نصب العین لے کر اٹھتی ہے۔ وہ ہمیشہ سب سے پہلے اسی کی فکر کرتی ہے۔ عرب کی جماعت اسلامیہ کی بے سروسامانی کو دیکھئے اور مدینہ کے اجنبی ماحول میں آ کر چند اجڑے بچھڑے افراد کا عالم ابتلا دیکھئے اور پھر ملاحظہ فرمائیے کہ کیسے اولین اسلامی

ریاست کی فوراً تاسیس کی جاتی ہے اور کیسے چند مہینوں میں دستور بن کر نافذ ہو جاتا ہے۔ نسلی اور مذہبی لحاظ سے گوناگوں متضاد عناصر کو اتنا جلد ایک دستور پر متحدہ کر دکھانا تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔)

اس زمانے کے حالات کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھیں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ کتنے بڑے پیمانے کا کارنامہ تھا اور اس کے پس منظر میں ایک لامثال سیاسی بصیرت اور گفت و شنید کی مہارت کام کرتی ملتی ہے۔ یہ دستوری دستاویز بھی اور دوسرے معاہدات اور معاملات اور جنگی منصوبے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ صرف ایک صوفی و درویش نہ تھے بلکہ اجتماعی معاملات کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لئے ماہرانہ حکمت سے آراستہ تھے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔

نظامِ مواخات

مدینہ کے معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ سینکڑوں مہاجرین کی
بحالی کا مسئلہ تھا گھر بار چھوڑ چھاڑ کر مسلسل لوگ اکھڑے چلے
آرہے تھے اور چند ہزار کی آبادی رکھنے والی متوسط سی بستی کو
انہیں اپنے اندر جذب کرنا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو تاریخ
میں جب بھی پیدا ہوتا ہے، پریشان کن بن جایا کرتا ہے۔ مدینہ
کے معاشرے اور اس کے صدر ریاست نے جس کمال حکمت
سے حل کیا اس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کوئی
آرڈیننس جاری نہیں کئے گئے۔ کوئی قانون نہیں ٹھونسے گئے۔
الاٹمنٹیں نہیں کی گئیں۔ مہاجرین کی تعداد متعین کر کے کوئی
قدغن نہیں لگائی کسی جبر سے کام نہیں لیا گیا۔ محض ایک اخلاقی
اپیل کے ذریعہ اس پیچ مسئلے کو چند روز میں حل کر لیا گیا۔ سرور
عالمؐ نے عقیدے اور نظریے اور مقصد کی صحیح معنوں میں ایک نئی
برادری پیدا کر دکھائی اور ایک ایک انصاری کے ساتھ ایک ایک

مہاجر کا برادرانہ رشتہ قائم کر دیا۔ انصار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے مال، مساکن، باغات اور کھیت آدھوں آدھ بانٹ کر رفقاء مقصد کو دے رہے تھے بلکہ بعض تو یہاں تک تیار ہو گئے کہ دو دو بیویوں میں سے ایک ایک کو طلاق دے کر اپنے دینی بھائیوں کے نکاح میں دے دیں۔ دوسری طرف مہاجرین کی خودداری کا نقشہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں کھیت یا بازار کا رستہ دکھا دو۔ ہم تجارت یا مزدوری کر کے پیٹ پال لیں گے۔

مجرد، بالخصوص نوعمر مہاجرین جو اپنے آپ کو تعلیم کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے ان کی اقامت گاہ ''صفہ'' (مسجد نبوی کا ایک چبوترہ) تھی تعمیری کام کے سلسلے میں یہ ایک اہم ادارہ تھا۔ اصحاب صفہ کی کفالت سوسائٹی کرتی تھی اور آنحضور صلعم خود ان کی ضروریات کی تکمیل میں سرگرم رہتے۔

پھر وہی کشمکش

یہاں تاریخ و سیرت کے پورے سلسلۂ واقعات کو پیش

کرنا مقصود نہیں ہے۔ مجملاً ہم نے یہ دیکھنا چاہا ہے کہ تحریک

اسلامی کی پود مکہ سے آکر مدینہ میں کس طرح نصب ہوتی ہے

اور کس طرح نئی کونپلیں نکالنے لگتی ہے۔ ماحول کیا تھا اور اب

ایک نئی موثر طاقت کے آجانے سے اس میں کس نہج پر نئی

حرکات شروع ہو رہی تھیں۔ سوئے ہوئے معاشرے کو جرس حق

نے آکر جگا دیا تھا۔ عمل کا ایک اسٹیج تیار ہو گیا تھا اور اس پر ایک

مثبت اور تعمیری طاقت اپنا کردار پیش کر رہی تھی۔ مثبت

کردار کے سامنے آتے ہی تاریخی قانون کا یہ تقاضا تھا کہ کوئی نہ

کوئی منفی کردار بھی نمودار ہو۔ تعمیری مہم کے مقابل میں منفیت کا

ضابطہ لازماً ایک تخریبی طاقت کو حرکت میں لانا چاہتا تھا۔ حق اگر

میدان میں آگیا ہو تو پھر ناگزیر تھا کہ باطل کے محاذ پر بھی گرما

گرمی پیدا ہو جائے۔ عاشقِ جانباز اگر کوچہ جاناں کی طرف

اقدام کرے تو پھر رقیب رُوسیاہ کی ضرورت بھی پیدا ہو جاتی ہے

۔مدینہ میں جس نئے معاشرہ کی اٹھان ہورہی تھی، اسے دیکھ دیکھ کر شیطان بری طرح تلملا رہا تھا۔وہ اپنے کچھ فدا کار اور جان نثار میدان میں لانا چاہتا تھا۔چنانچہ اسے آلہ کار مل گئے اور وہ ان کو اٹھا کر اسٹیج پر لے آیا۔تحریک کو پہلے سابقہ ابراہیم علیہ السلام کے نام لیواؤں سے تھا،اب اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کے جانشین جبہ ہائے تقدس پہنے اور کتاب اللہ بغل میں لئے خراماں بڑھتے دکھائی دیئے۔تحریک اسلامی کے ڈرامے میں پہلے جو پارٹ متولیانِ کعبہ نے ادا کیا تھا،اب مدینہ میں وہی پارٹ فرزندانِ بیت المقدس نے اپنے ذمہ لیا۔

یہود کا تاریخی مقام اور پارٹ

تاریخ اسلام و جاہلیت کی یہ عجیب ٹریجیڈی ہے کہ دین حق کی مزاحمت کرنے کی خدمت سب سے بڑھ کر جوشِ ایمانی کے ساتھ ہمیشہ اہل مذہب ہی نے سر انجام دی ہے۔اہل

مذہب جس کو دینِ حق کی دعوت کی پہلی آواز سنتے ہی اولین صفوں میں جا کر کھڑا ہونا چاہئے، وہی ہمیشہ "اول کافر" بنتے رہے ہیں ۔ (الاماشاء اللہ) ۔ اہل مذہب ابتدا میں مذہب کے خادم اور علمبردار ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ جب ان کا ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے کچھ مفاد مذہب سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو پھر وہ مذہب کو اپنا تابعدار بنا لیتے ہیں ۔ وہ آہستہ مذہب کے نام پر اپنے کچھ مستقل حقوق پیدا کر لیتے ہیں، پیروان مذہب سے وہ کچھ اپنے طبقاتی مطالبات منوا لیتے ہیں اور کچھ اعزازات ان کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں ۔ مذہب اپنے پیروں کے دورِ زوال میں ہمیشہ انہی مراحل سے دوچار ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر مذہب ایک اچھے نفع بخش کاروبار کی سطح پر آجاتا ہے اور وہ موروثی جاگیر بنتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر وعظ مال تجارت بن جاتے ہیں ۔ علم ذریعۂ معاش ٹھہرتا ہے ۔ فتوے متاعِ بازار بن کر اپنا ایک مارکیٹ ریٹ پیدا کر لیتے ہیں ۔ دینی

مناصب روحانی قیادت و اقتدار کا زینہ قرار پاتے ہیں۔ اس مقام پر جب ایک بار اہل مذہب آ پہنچتے ہیں تو پھر ان کا کاروباری ذہن ہر معاملے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارا ایک بار اہل مذہب آ پہنچتے ہیں تو پھر ان کا کاروباری ذہن ہر معاملے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارا مفاد محفوظ رہتا ہے یا نہیں اور ہمارا منصب اور ہماری پوزیشن کسی اور طرف تو منتقل نہیں ہوئی جاتی۔ کاروباری ذہن جب ان اوصاف کے ساتھ دائرہ مذہب میں آ گھستا ہے تو اہل مذہب:

...... کسی کی طرف سے اختلاف کو گوارا نہیں کر سکتے اور نہ کسی بڑے مقصد کے لئے دوسروں کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

...... اپنے اندر کسی کمزوری یا غلطی کو ماننے اور اس کی اصلاح کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

......قیادت وارث کی کرسی چھوڑ کر کسی دوسرے کی دعوت پر ادا سے فرض نہیں کر سکتے۔

ٹھیک یہی مقام تھا جس کی آخری سرحد پر یہود آ پہنچے تھے۔ وہ یہ ہرگز نہیں مان سکتے تھے کہ حق کے گروہی دائرے کے باہر بھی پایا جا سکتا ہے۔ وہ نہیں مان سکتے تھے کہ ان کے پیچھے لگ کر چلے بغیر بھی کوئی راہ یاب ہو سکتا ہے۔ وہ نہیں مان سکتے تھے کہ رہنمائی کا منصب کسی دوسرے کو بھی مل سکتا ہے۔

مخالفت قریش مکہ نے بھی کی اور مخالفت یہود نے بھی کی اور دونوں میں سے کسی نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر دونوں کے مخالفانہ پارٹ میں بڑا بھاری فرق ہے۔ جب ہم تجزیہ و موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو اولین حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت میں اصل کار فرما روح جذبہ استکباری تھی۔ لیکن یہود پر حسد کا جذبہ چھایا ہوا تھا۔ وہاں احساس برتری کی

بیماری تھی اور یہاں احساس کہتری کا روگ تھا۔ اسی لئے وہاں کھلا کھلا انکار اور تصادم تھا اور یہاں مکاری اور عیاری کا مزاج مخالفانہ سرگرمیوں میں نمایاں تھا۔ وہاں بہادرانہ جسارت تھی اور یہاں بزدلانہ شرارت۔ وہاں مخالفت سیدھی تشدد کے رخ پہ ارتقاء کرتی رہی تھی لیکن یہاں وہ نجوی اور سازش اور نفاق کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ مکہ میں صرف مسلم اور کافر دو گروہ تھے لیکن مدینہ میں مسلم اور کافر طاقتوں کے بیچ میں ایک تیسرا کردار نفاق کا بھی نمودار ہوگیا۔ اس مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جامد مذہبیت اور فاسد دین داری کھلے کفر و شرک اور صریح جاہلیت سے زیادہ پست فطرت رکھتی ہے اور مخالفت حق میں زیادہ گھٹیا کردار پیش کرتی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس رزم کفر و دین میں یہود کی جامد مذہبیت اور فاسد دین داری نے اسلام کے مقابلے پہ کفر و شرک کی طاقت کے پلڑے میں اپنا پورا پورا وزن تعاون ڈال دیا۔

حالانکہ بڑے سے بڑے اختلاف کے باوجود انسے خدا پرستانہ و اخلاق پسندانہ مسلک کے علمبرداروں کے ساتھ زیادہ ہمدردیاں ہونی چاہئے تھیں۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اس بات کی ہو سکتی تھی کہ یہود مخالفت اسلام میں اپنی پوزیشن کفار و مشرکین سے بالکل الگ ممیز رکھتے لیکن "تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم" کی دردمندانہ پکار سننے کے باوجود انہوں نے انسان اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کے پاکیزہ دینی افکار و اعمال کو چھوڑ کر ابوجہل اور ابولہب جیسے گھٹیا انسانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور جامد مذہبیت اور فاسد دینداری کا یہ بھی ہمیشہ تاریخی رول رہا ہے کہ وہ معرکہ کارزار میں دینی محاذ پر کسی قیمت کے عوض بھی اپنا تعاون پیش نہیں کر سکتی بلکہ لازماً وہ دین کی دشمن طاقتوں کی گود میں جا گرتی ہے۔ اس کا قارورہ ہمیشہ کفر و الحاد اور فسق و فجور کے پیکروں سے ملتا ہے۔ یہاں گفتگو چند مستثنیٰ افراد پر نہیں ہو رہی جو کسی گروہ کے اندر سے بدترین دور

فساد میں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ ہم عمومی کلیہ اخذ کر رہے ہیں۔

یہ تھا موقف جو یہود نے لیا! وہ اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور علم و تقویٰ کے سارے ہتھیار سنبھال کر تخریب پسندانہ منفیت کے مورچوں پہ جا ڈٹے اور انہوں نے عملاً کفار و مشرکین کو اپنا پورا پورا تعاون پیش کر دیا۔ انہوں نے داعیِ حق اور تحریک اسلامی اور اس کے کارکنوں کے خلاف پھبتیاں کسیں، مذاق اڑائے، نت نئے سوالات اور اعتراضات گھڑ گھڑ کر کٹ حجتیاں کیں، الزامات لگائے، پروپیگنڈے کے طوفان اٹھائے، مخبریاں اور جاسوسیاں کیں، مسلمانوں کو باہم دگر لڑانے کے منصوبے اختیار کئے۔ تکفیر و تفسیق کے فتوے لگائے۔ رحمت دو عالم کے قتل کی تدبیریں کیں اور جنگ اور ایمرجنسی کے حالات میں سخت قسم کی غداریاں کیں۔ اپنی طرف سے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا لیکن شروع سے آخر تک یہ ایک بڑے مغالطے میں رہے..... اور منفی مزاج کی تخریبی مہموں کو اٹھانے والی جماعتیں

ہمیشہ اس مغالطے میں رہتی ہیں۔ (لیکن بعد والوں کو اس سے سبق لینے کی بھی توفیق نہیں ہوتی) ...... کہ کسی اصولی اور تعمیری تحریک کا توڑ ایسے لوگ کامیابی سے کر سکتے ہیں جو خود بے اصول ہوں، کوئی تعمیری نقشہ نہ رکھتے ہیں اور جو اخلاقی پستی کی آخری گہرائیوں میں جا گرے ہوں۔ درحقیقت ایسے لوگوں کا پارٹ بالکل اس نوعیت کا ہوتا ہے جیسے سورج کی شعاع افق سے چڑھ کر چمگادڑ فضاء میں اپنے پر پھیلا کر زمانے کو تاریک رکھنے کے درپے ہوں۔ جیسے شہسواروں کے کسی دستے کا راستہ روکنے کے لئے چند مچھر اور چند مکھیاں اپنی بھنبھناہٹ کا پورا زور شور دکھا دیں۔ جیسے چودھویں کے چاند کو دیکھ کر کوئی گنوار اس کی طرف منہ اٹھا کر تھوک دے۔

جن لوگوں میں خود اپنی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی ہو جن کے پاس کوئی جاندار پیغام موجود نہ ہو، جن کا اخلاق و کردار زمانے کے لئے کوئی جاذبیت نہ رکھتا ہو اور جن سے کسی تعمیری

خدمت کی توقع انسانیت کو نہ رہی ہو۔ وہ محض دوسروں کا راستہ روک کر اور ان کا منہ چڑا کر اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے۔ جس کے پاس جمود اور فساد اور بگاڑ اور تخریب کے سوا، اور کوئی متاع حیات باقی نہ رہی ہو۔ وہ اصلاحی و تعمیری کام کرنے والی کسی متحرک طاقت کے منہ آ کر اپنے اندر قدر و قیمت پیدا نہیں کر سکتے۔ انجام کار ایسوں کے حصے میں ذلت و نامرادی کے سوا، کچھ نہیں آتا۔ مگر جب جذباتی ردعمل کی رو میں بہہ کر کوئی فاسد طاقت اندھی ہو جاتی ہے تو پھر وہ انجام کو نہیں سوچتی۔ بس آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ یہود کی فاسد طاقت بھی احساس کہتری اور حسد کے مارے اندھی ہو کر اسلام سے الجھنے لگی۔

یہود کا کردار مسلمانوں کے کردار کے بالمقابل رکھ کر دیکھنے سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سچائی کے کسی علمبردار کی صدا پر لبیک کہنے والوں کا اخلاق جتنا بلند ہوتا جاتا ہے اس کی مخالفت کرنے والوں کی سیرتوں میں اتنا ہی زوال پیدا ہوتا جاتا

ہے۔ مثبت تحریک اپنے دائرہ میں انسانیت کو جتنا زیادہ سنوارتی ہے۔ منفی ردعمل اپنے حلقہ میں اتنا ہی زیادہ فساد اور بگاڑ پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کے سربراہ کار کے سامنے ایک طرف بڑا وسیع اور متعدد پہلو رکھنے والا تعمیری منصوبہ تھا دوسری طرف مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی اور ان کو معاشی سہارا بہم پہنچانے کا پرابلم تھا۔ تیسری طرف قریش مکہ کی طرف سے ہر لحظہ حملے کا امکان تھا اور اس کے لئے دفاعی استحکام کی ضرورت تھی۔ اور ان ساری مشکلوں میں اضافہ کرنے والی بڑی مشکل یہ تھی کہ مدینہ کی نوخیز ریاست اور زیر تشکیل معاشرے کے اپنے دائرے میں غداروں اور سازشیوں کی ایک بڑی بھاری تعداد فتنہ انگیزیاں کر رہی تھی۔ غور کرو کہ سرور عالم کی ذمہ داریاں کتنی نازک اور پیچیدہ ہو گئی ہوں گی۔ خیال میں لاؤ کہ ایک جان کتنی کٹھنائیوں میں دن رات الجھی رہتی ہوگی۔ اندازہ کرو

کہ چھوٹی سی اسلامی جماعت اور ابتدائی مراحل سے گزرتی ہوئی تحریک کیسے جان جوکھم میں پڑی ہوگی اور اس ساری صورت حال کو پیدا کرنے کا سہرا تاریخ میں یہود کے سر بندھا نظر آتا ہے ...... جی ہاں! ایک خدا کو ماننے والوں، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے پروانوں، تورات کے علمبرداروں اور علم و تفقہ اور تقدس و تقویٰ کے ٹھیکیداروں کے سر۔

"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

ابتداء میں یہود کو حضور سرورِ عالمؐ اور اسلام سے بڑی اچھی امیدیں تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نئی طاقت انہی کی طرح بنو اسماعیل سے برسرِ اختلاف ہے، یہود جن انبیاء کے نام لیوا تھے ان کو مانتی ہے، ان کی کتاب کا احترام کرتی ہے اور انہی کے مرکزِ عبادت، یعنی بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے ہے۔ بنابریں ان کا اندازہ یہ تھا کہ آہستہ آہستہ محمد رسول اللہؐ اور آپؐ کے رفقاء کو اپنے اندر جذب کر لے جائیں گے۔ یہود کا

ذہن حق پرستانہ طرز پر نہیں سوچ رہا تھا بلکہ یہ خالص سوداگرانہ طرز فکر تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اجڑے اجڑے لوگ جو سینکڑوں کی تعداد میں یوں اکھڑے چلے آ رہے ہیں۔ ان کو ہم اپنے باڑے کی بھیڑیں بنا سکیں گے۔ اسی امید پر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بغیر کسی لمبی چوڑی رد و کد کے معاہدات استوار کر لئے، اور اس سیاسی تنظیم کو گوارا کر لیا جو مدینہ میں قائم کی جا رہی تھی۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ یہ سیاسی طاقت جو اپنی کونپلیں نکال رہی ہے۔ یہ تو بس ہماری جیب میں ہے۔ ہماری پیری اور مشیخت کی گدیاں اس کو چار جانب سے احاطہ کئے ہوئے ہیں اور ہمارے علم و تقویٰ کی ساکھ اپنا دامن اس کے اوپر پھیلائے ہوئے ہے۔ کوئی سوال نہ تھا حق و صداقت تک رسائی حاصل کرنے کا، کوئی کاوش نہ تھی فکر و کردار کو سنوارنے کی، کوئی اہتمام نہ تھا عاقبت بنانے کا۔ مجرد ایک گروہی مفاد کی سیاست تھی جو ان کم بختوں کے سر پر سوار تھی۔ ان کے نزدیک تو گویا مدینہ کے ماحول میں ان کے گھر کے دروازوں پر شکار آ آ کر جمع ہو رہا

تھا۔ وہ اپنے دام وفتراک تیار کئے گھات میں بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہ میں گویا مچھلیاں تھیں جو غول در غول ساحل کے پاس آرہی تھیں اور یہ ماہی گیر کھلی ہوئی باچھوں کے ساتھ مذہبی مکاری کی ڈوریاں اور کنڈیاں پانی میں ڈال رہے تھے مگر کچھ ہی مدت کے تجربے سے ان کی خوش فہمیوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ انہیں اسلامی جماعت نے جتادیا کہ یہ کوئی ستا شکار نہیں ہے۔ یہ ایک مضبوط طاقت ہے کہ شکاری اس کے ہاتھوں خود شکار ہو کے رہ جانے والے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے آہستہ آہستہ ایک انقلابی مزاج کی ریاست پروان چڑھنے لگی اور یہ ریاست اپنے وجود میں ایک قلعے کی طرح مضبوط بنتی گئی۔ یہود کی چند ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ یہ ریاست جس کے بنانے میں دستوری معاہدہ کی بناء پر وہ خود بھی حصہ دار ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں بن سکتی اور نہ اس میں انگلی دھنسانے کی ان کی کوئی جگہ مل سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے لئے جو مقام سیادت اس میں حاصل کرنا چاہا اس کے بارے میں ان کو جلد ہی نامرادی کا سامنا کرنا

پڑا۔ اس کے مختلف اداروں اور سرگرمیوں میں انہوں نے نفوذ اور تصرف حاصل کرنے کی جو کوششیں کیں ان میں بار بار منہ کی کھائی اس ریاست کے صدر اور کارپردازوں اور اس کے اصولوں پر ایمان رکھنے والے شہریوں کو انہوں نے ہاتھ میں لینے کے جتنے بھی منصوبے اختیار کئے وہ سب ناکامی کا شکار ہو گئے۔ الٹا اولین مراحل میں یہ ہوا کہ یہود کے اپنے آدمیوں نے محسن انسانیت کی پیش کردہ صداقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا شروع کر دیا۔ یہ "خطرناک" انقلابی رو عامیوں ہی کو نہیں، ان کی بعض سرکردہ ہستیوں کو بھی بہا لے گئی۔ تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا اسارا بازار تقدس اجڑ جانے والا ہے اور ان کے باڑے کی بھیڑیں ایک ایک کر کے ہاتھ سے جانے والی ہیں۔ یہ سودا یہود کو بہت مہنگا پڑا۔ ایک طرف وہ پورے معاہدہ مسلم ریاست کے نظام کے پابند ہو چکے تھے، دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ وفائی مقصد کے لئے حلیفانہ معاہدات استوار کر چکے تھے، اور تیسری طرف وہ دیکھ

رہے تھے کہ یہ سب کچھ جس مقصد کے لئے کیا گیا تھا وہ غارت ہوا جا رہا ہے۔ چنانچہ اندر ہی اندر ان میں ایک حاسدانہ لاوا پیدا ہونے لگا۔ اور وقتاً فوقتاً یہ گندہ مادہ ان کے اجتماعی بدن کے ناسوروں سے بہنے لگا۔ خصوصاً تحویل قبلہ پر تو یہ جذباتی پیپ یہودی سوسائٹی کے مسام مسام سے رسنے لگی! اس جذبہ نے اولاً شر انگیزی کا راستہ اختیار کیا۔ پھر یہ تخریبی کارروائیوں کی شکل میں ڈھلا۔ حتیٰ کہ مرتبہ کمال تک پہنچ کر اس نے غداری کی صورت اختیار کر لی۔ آیئے ہم مدنی دور میں اس جذبہ کے ردعمل سے پیدا ہونے والی ان مخالفانہ سرگرمیوں کا جائزہ لیں جس سے انسانیت کا سب سے بڑا خیر خواہ اور اس کے ساتھی دوچار ہوئے اور اسلامی ریاست کو سخت مشقتیں اٹھانی پڑیں۔

کھچاؤ

مدینہ کی نوخیز بھاری اسلامی جماعت جن ذمہ داریوں میں گھری ہوئی تھی ان کے لحاظ سے اس کے ایک ایک فرد کی زندگی بڑی قیمتی تھی اور ایک ایک کارکن کا پارٹ بڑا اہم تھا۔ علی الخصوص جو لوگ صف اول کے کارکن تھے، ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی سرورِ عالمؐ اور آپؐ کے رفقاء کے لئے بڑا بھاری حادثہ تھی۔ ابو امامہ اسعد بن زرارہ جو بنو نجار پر نقیب مقرر کئے گئے تھے، ایسا ہی اہم مقام رکھتے تھے۔ بالکل ابتدائی دور میں ان کو عالم آخرت سے بلاوا آ گیا اور ایک جلیل القدر سپاہی تحریک اسلامی کی صفوں میں سے گم ہو گیا۔ حضورؐ کے لئے یہ صدمہ فی نفسہٖ بڑا صدمہ تھا لیکن اس صدمہ کو مدینہ کی اسلام دشمن طاقت نے اپنے مفسدانہ پروپیگنڈے کے ذریعہ دگنا کر دیا۔ یہود اور ان کا ساتھ دینے والے منافقین کہتے پھرتے تھے کہ دیکھا کیا ہے اگر یہ محمدؐ سچا نبی ہوتا تو اس کا ایسا سرگرم ساتھی ایسے عالم میں کیوں

مرا ہوتا۔ گویا منافقین کے ہاں اس موت پر گھی کے چراغ جل گئے۔ وہ قلب حساس جو چاروں طرف سے دکھوں کے تیروں کی زد پر تھا۔ وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ بئس المیت ابو امامۃ لیھود ومنافقی العرب، یقولون لو کان نبیا لم یمت صاحبہ ولا املک لنفسي ولا لصاحبي من اللہ شیئاً (سیرت ابن ہشام جلد ۲۔ ص ۲۷ ابر اہوا ابو امامہ کا مرنا۔ یہود اور منافقین عرب کے لئے کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو اس کا ساتھی نہ مرتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے نہ میں خود بچ سکتا ہوں اور نہ اپنے کسی ساتھی کو بچا سکتا ہوں"۔) اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں کے دلوں کے پھوڑے کیسے پکے ہوئے تھے۔ بنو نجار نے آکر حضورؐ سے درخواست کی کہ اب ہمارے لئے کوئی اور نقیب مامور فرما دیجئے۔ بنو نجار کی تسکین کے لئے آپ نے خود اپنے آپ ہی کو بد بنائے قرابت ان کا نقیب قرار دیا۔ انتم أخوالي وانا بما

فیکم، وانا نقیبکم"..!

یہود نے جن شرائط پر دستوری معاہدہ پر دستخط ثبت کئے
تھے ان کی وجہ سے وہ اس پر قادر نہ تھے کہ تحریک اسلامی کو روز
افزوں ترقی سے روک سکیں۔ ان کی ناک کے نیچے عامۃ الناس
اور ان کے سربراہ کار اسلام کے جھنڈے کی طرف لپک رہے
تھے اور ان کی گدیاں اور پیریاں، ان کی خانقاہیں اور دارالافتاء
دم سادھے یہ دوررس انقلاب واقع ہوتے دیکھ رہے تھے۔
یہاں تک کہ تحریک حق کی لہریں ان کے گھروں کے دروازوں
سے داخل ہونے لگیں۔ کاروباری مذہبیت کے صبر کا پیمانہ اس
حادثہ کے پیش آجانے پر لازماً چھلک جاتا ہے کہ اس کے اپنے
حلقے کے افراد ..... بالخصوص نمایاں اور قیمتی افراد ..... ٹوٹنے
لگیں۔ دوسری طرف ہر انقلابی تحریک کی قوت نفوذ ہوتی ہی اس
بلا کی ہے کہ منفی رجحان کے ساتھ جو لوگ اس کے مقابلے پر آتے
ہیں وہ خود انہی کے گھروں سے نوجوان طاقت کو اٹھا کر ان کے

مقابلے پہ لے آتی ہے۔ بیٹے باپوں سے، بہویں خسروں سے، بیٹیاں ماؤں سے، پوتے دادوں سے، غلام آقاؤں سے اختلاف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بوڑھی مذہبیت جب نوجوان تحریکیت کے اس داخلی حملے سے دوچار ہو جاتی ہے تو وہ مغلوب الغضب ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کے صبر و تحمل کا قطعی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مدینہ میں بھی تاریخ نے اپنا یہی معمول دہرا دیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کس زور و شور سے سچائی کا بول بالا ہو رہا تھا اور کس تیز رفتاری سے گھر گھر نئے نظام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس تغیری احوال کو دیکھ کر یہود کے سینوں پہ سانپ لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ خصوصاً جب قبائل کے سردار مشہور اور با اثر شخصیتیں اسلام کی فطری پکار پہ لبیک کہتی تھیں تو حسد اور احساس کہتری کو وجہ سے پورے یہودی معاشرے کے بدن پہ کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ مثلاً ان کے دیکھتے دیکھتے جس دن ابو قیس بن ابی انس نے کلمہ حق کو سینے میں جگہ دی ہوگی۔ اس دن یہودیت کے

سینے میں کیا کیا ابال نہ اٹھے ہوں گے یہ ایک نامور بزرگ تھے۔
دور جاہلیت ہی میں طبیعت پلٹا کھا گئی تھی۔ محض فطرت کی
رہنمائی سے بت پرستی چھوڑ دی۔ غسل جنابت کو لازم ٹھیرالیا۔
حائضہ عورتوں سے پرہیز اختیار کیا۔ پہلے نصرانیت کی اجتناب
رکھا۔ کہتے تھے کہ میں ابراہیمؑ کے رب کی بندگی، و غلامی کرتا
ہوں۔ یہ بزرگ ضعیف العمر تھے۔ حق بات کہنے میں بہت
جرأت دکھانے والے اور جاہلیت میں اللہ تعالٰی کی عظمت کا
اعلان کرنے والے تھے۔ اپنے دلی جذبات کو شعر کا قالب دیا۔
چند اشعار کتابوں میں منقول ہیں۔ ایسے ذہن اور نیک سیرت
بزرگ کا مقام خاصا نمایاں ہونا ہی چاہیے۔

کیا بعید کہ یہود کی ان سے بحثیں رہتی ہوں اور انہوں
نے ان بزرگ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوششیں صرف کی ہوں۔
لیکن اس شخص کی طرف فطرت صالحہ نے دین حق کا جو ذوق پیدا
کر دیا تھا وہ بجز داعیٔ اسلام کے کسی سے تسکین نہ پا سکا۔ حضورؐ

مدینہ پہنچے تو قسمت کے جاگ اٹھنے کی گھڑی آ گئی اور یہ بزرگ

حلقۂ تحریک میں شامل ہو گئے اور بہترین طریق سے اسلام پر عمل

پیرا ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہود میں جو ردِ عمل ہوا ہو گا اس کا کچھ

نہ کچھ اندازہ قوتِ تصور کے بل پر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں تک تو خیر پھر بھی جو کچھ ہوا بیرونِ در ہوا۔

سنگین حوادث تو وہ تھے جو تحریک کے درونِ خانہ گھس آنے پر

رونما ہوئے۔ ان میں سے یہود کے ذہنی توازن کو بالکل تلپٹ

کر دینے والا واقعہ ان کے ایک جلیل القدر عالم کا ذہنی انقلاب

تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اکابر..... چاہے وہ اہلِ دنیا ہوں یا اہلِ

مذہب..... میں تو قبولِ حق کی صلاحیتوں کا تناسب بہت کم ہوتا

ہے لیکن ہر دائرے میں فطرتِ صالح رکھنے والے افراد ضرور

موجود ہوتے ہیں۔ اور وہ خورشیدِ صداقت کے جلوہ آرا

ہو جانے پر آنکھیں موند کر تعصب کے غاروں میں جا نہیں

چھپتے، بلکہ سنہری اور روپہلی شعاعوں کے لئے دل اور دماغ کے

دریچے کھول دیتے ہیں۔ ان صفوں سے اگرچہ کم لوگ آتے ہیں مگر جو آتے ہیں وہ بڑی چیز ہوتے ہیں کیونکہ ان کو مفاد اور مناصب کی بڑی بھاری زنجیریں اور بیڑیاں توڑ کر آنا ہوتا ہے۔ یہود کی صفوں میں ایسے ہی ایک بزرگ عبداللہ ابن سلام تھے۔ قبل اسلام ان کا نام حصین تھا۔ یہ بلند پایہ عالم و محقق تھے اور مذہبی لیڈر تھے۔ ان کا تعلق بنی قینقاع سے تھا۔ حضورؐ سے ملاقات کے بعد انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور اپنے گھر والوں کی بھی دعوت دی اور متاثر کرلیا۔ چنانچہ سب تحریک اسلام کے حلقے میں داخل ہوگئے ان کے قبول اسلام کی داستان سنئے جسے ان کے ایک عزیز نے روایت کیا ہے:

"میں نے جب اللہ کا پیغام لانے والی ہستی کے بارے میں سنا تو آپؐ کی صفات آپؐ کے نام اور آپؐ کے زمانے کو پہچان لیا۔ کیونکہ ہم اس کے انتظار میں تھے۔ سو اس اطلاع پر میں دل ہی دل میں خوشی محسوس کر رہا تھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔

تا آنکہ رسولؐ خدا مدینہ آپہنچے۔ جب آپؐ قبا میں بنی عمرو بن
عوف کے گھرانے میں پہنچے تو ایک شخص آیا اور اس نے آپ کی
تشریف آوری کی اطلاع مجھے اس عالم میں دی کہ میں اپنے کھجور
کے درخت کی چوٹی کا چڑھا کام میں مصروف تھا۔ میری پھوپھی
خالدہ بنت حارث نیچے بیٹھی تھیں۔ میں نے جونہی تشریف
آوری کی خبر سنی، تکبیر بلند کی، پھوپھی نے میری تکبیر سن کو مجھ سے
کہا: "خدا تجھے غارت کرے۔ تجھے اگر موسیٰ بن عمران کی آمد کا
مژدہ بھی ملا ہوتا تو اس سے بڑھ کر اظہار مسرت نہ کرتا"۔ میں
نے کہا "پھوپھی جان! خدا کی قسم! یہ موسیٰ بن عمران کے بھائی
ہیں اور انہی کے دین پر کاربند ہیں۔ یہ وہی پیغام لائے ہیں۔
جو موسیٰ لائے تھے۔ اس پر وہ کہنے لگیں: اے میرے برادر
زادے! کیا یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا
ہے کہ وہ قیامت کی گھڑی کے قریب اٹھایا جائے گا؟ میں نے کہا
کہ ہاں یہی تو وہ ہے۔ پھر میں خدا کا سندیا لانے والے کی

خدمت میں پہنچا اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور ان کو بھی دعوت دی سو وہ بھی حلقۂ اسلامی میں داخل ہو گئے۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲۔ ص ۹۔ ۱۴۸)

یہ نو مسلم عالم چونکہ یہود کی کمزوریوں کے راز داں، ان کی حاسدانہ نفسیات اور ان کے ذلیل کردار کے رمز شناس تھے، اس لیے خوب سمجھتے تھے کہ میرے ذہنی انقلاب پر کیا تاثر دیا جائے گا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب مفاد پرستی کی بناء پر گروہ بندیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو کردار اتنا گر جاتا ہے کہ اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے کے بجائے اپنے بُروں کو اچھا اور دوسروں کے اچھوں کو بُرا قرار دیا جاتا ہے۔ اپنے باڑے کی بھیڑ کالی ہو تو بھی سفید شمار ہوتی ہے اور باہر کی بھیڑ سفید ہو تو بھی اسے کالی کہا جاتا ہے۔ بلکہ اپنے باڑے کی سفید بھیڑ باڑ پھاند کر باہر ہوتے ہی کالی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اس قماش کے مذہب داروں کا حال یہی رہا ہے کہ جب تک کوئی شخصیت ان کے ساتھ رہتی ہے

یا کم سے کم اس سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اس کی سرگرمیاں اپنے
کاروبار پر اثر انداز ہونے والی ہیں، تو اس کی خوبیوں کا کھلے دل
سے اعتراف کیا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھار تو پورے مبالغے سے اس
کی علمی و کرداری عظمت بیان کی جاتی ہے۔ لیکن وقت کی چند
گردشوں کے ساتھ جب ایسی عظیم شخصیت کا پارٹ کسی بزرگ
کی مذہبی مارکیٹ کے لیے ضرر رساں بن جاتا ہے تو معاً رائے
گرامی کروٹ لیتی ہے، اور زبان و قلم چلتی کھاجاتے ہیں۔ کوئی
عالم تھا تو اب جاہل قرار پائے گا۔ مومن تھا تو اب فاسق و کافر
گردانا جائے گا۔ خادم دین و ملت تھا تو اب وہ ضال و مضل گنا
جائے گا۔ ادب و احترام کا مستحق تھا، تو اب گالیوں کا ہدف بن
جائے گا۔ عبداللہ بن سلام کے سامنے یہود کی مسخ شدہ فطرت کی
یہی پستیاں تھیں اور انھوں نے تہیہ کرلیا کہ ان پستیوں پر سے
تصنع کے پردے اٹھوا دیئے جائیں۔ دل ہی دل میں ایک
ڈرامے کا نقشہ بنا کر انھوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ مناسب

موقع پر محسنِ انسانیت کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یہود
ایک باطل زدہ گروہ ہیں اور ان کے فسادِ احوال کو بے نقاب
کرنے کے لیے آپ مجھے اپنے گھر میں پس پردہ بٹھا دیں اور
ان کی نگاہوں سے مخفی رکھ کر ان کی رائے میرے بارے میں
دریافت فرمائیں اور پھر ملاحظہ فرمائیں کہ میرے اسلام لانے
سے ناواقف ہوتے ہوئے مجھے کیا مقام دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر
ان کو میرے قبولِ اسلام کا علم ہوگیا تو پھر وہ مجھ پر بہتان
باندھیں گے اور عیب جوئی کریں گے۔ حضورؐ نے ایسا ہی کیا کہ
عبداللہ بن سلام کو گھر میں آڑ کے پیچھے بٹھا دیا اور ادھر یہودی
بزرگ آ پہنچے۔ باتیں ہوئیں۔ سوالات پوچھتے رہے اور جواب
دیئے جاتے رہے۔ آخر میں رسولِ خداؐ نے پوچھا: "حصین بن
سلام تم میں سے کیسے آدمی ہیں؟" کہنے لگے وہ ہمارے سردار
ہیں اور ہمارے ایک سردار کے فرزند ہیں۔ ہمارے ایک مردِ
جلیل ہیں۔ ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو

عبداللہ بن سلام اوٹ سے باہر آ گئے اور ان کو مخاطب کر کے کہا:

''اے گروہ یہود! خدا کا خوف کرو اور جو دین حضورؐ کے ذریعہ آیا ہے اسے اپنا لو۔ کیونکہ خدا کی قسم! تم خوب سمجھتے ہو کہ آپؐ اللہ کے فرستادہ ہیں۔ تم حضورؐ کے اسم گرامی اور آپؐ کی صفات کا تذکرہ اپنے ہاں تورات میں لکھا دیکھتے ہو۔ سو میں تو گواہی دیتا ہوں کہ حضورؐ خدا کے فرستادہ ہیں اور آپؐ پر ایمان لاتا ہوں اور آپؐ کی تصدیق کرتا ہوں اور آپؐ کو پہچانتا ہوں۔'' یہود پردہ اٹھا دینے والے اس ڈرامے کو دیکھ کر بہت سٹپٹائے اور کہنے لگے ''تم جھوٹے ہو اور پھر عبداللہ بن سلام کے درپے ہو گئے۔ ابھی چند ثانیے پہلے جس شخص کو سید اور عالم اور مرد جلیل قرار دیا تھا، گھڑی بھر میں اسی کو جھوٹا آدمی کہہ رہے تھے۔ عبداللہ نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ میں نے حضورؐ سے کہہ نہیں دیا تھا کہ یہ ایک باطل زدہ گروہ ہے۔ یہ سرکشی، جھوٹ اور بدائی سے آراستہ لوگ ہیں۔ اسی دلچسپ طریقے سے عبداللہ بن سلام نے اپنے

اور اپنے گھر والوں کے اسلام کا اعلان کیا۔ تصور کیجئے کہ یہود کے دل و دماغ پر کیا واردات گزر رہے ہوں گے۔ (سیرت ابن ہشام جلد۲ ص ۱۳۹۔۱۳۸)

ایسا ہی ایک واقعہ مشہور بزرگ و عالم مخیریق کا ہے جو ذرا بعد کے دور میں پیش آیا۔ یعنی یوم اُحد پر! یہود میں سے یہ صاحب بہت مال دار بھی تھے اور کھجوروں کے باغات کے مالک تھے۔ اپنے علم کی بناء پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات سے وہ آپ کو پہچان گئے تھے۔ یہاں تک کہ یوم اُحد آ گیا اور اتفاق سے اسی دن یوم سبت پڑتا تھا۔ کسی مجلس میں انھوں نے کہا کہ: "اے گروہ یہود! خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمدؐ کی مدد کرنا تم پر لازم آتا ہے"۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ ــــــ اہل شرک کے مقابلے میں مسلم جماعت کی امداد اصولاً تم پر واجب ہے، دوسرے بروئے معاہدہ تم اس بات کے پابند ہو کہ پیش آمدہ تصادم میں اس حلیف کا طاقت کا ساتھ دو۔ اس پر جو جواب

یہود نے دیا، وہ حیلہ باز اور نکتہ طراز مذہبی ذہن کی گھناؤنی تصویر کو پوری طرح سامنے لے آتا ہے۔ کہنے لگے کہ "آج کا دن یوم سبت ہے۔" اس جواب پر درشتی سے مخیریق نے کہا: "کوئی سبت نہیں تمہارے لیے!" پھر اس فرض شناس مجاہد نے ہتھیار سنبھالے اور شہر سے نکل کر میدانِ اُحد میں رسول اللہؐ سے جا ملے۔ جاتے ہوئے اپنے اہلِ خاندان سے یہ بات طے کرتے گئے کہ اگر میں آج مارا جاؤں تو میرے تمام اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیئے جائیں اور وہ اللہ کی رہنمائی کے تحت جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ چنانچہ یہ جانباز میدان میں کام آ گیا۔ اور اس کے ترکہ کو رسول خداؐ نے اپنے قبضہ میں لے کر صرف کیا۔ کسی قدر اختلاف اس بارے میں ہے کہ مخیریق اسلام لائے تھے یا نہیں۔

تحریکِ اسلامی کی اس فاتحانہ یلغار پر یہود کی فاسد مذہبیت کا جو باطنی ردِ عمل تھا اس کا اندازہ اسی سلسلے کے ایک

دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب

یہود اد بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے والد اور چچا کی نگاہ میں ساری

اولاد سے زیادہ چہیتی تھی اور دونوں ہمہ وقت ساتھ رکھتے تھے۔

جب رسول خدا مدینہ آئے اور قبا میں قیام فرمایا تو میرے والد

حیی بن اخطب اور چچا ابو یاسر بن اخطب منہ اندھیرے ملاقات

کے لیے گئے۔ لوٹے تو غروب آفتاب کا وقت تھا۔ معلوم ہوتا تھا

کہ بہت تھکے ماندے اور پریشان خاطر ہیں۔ وہ بہت دھیمے

انداز سے چلے آرہے تھے۔ میں معمول کے مطابق مسکراتی ہوئی

ان کی طرف متوجہ ہوئی لیکن بخدا پریشانی کے مارے دونوں میں

سے کسی نے میری طرف التفات نہ کیا۔ میرے چچا ابو یاسر

میرے والد سے کہہ رہے تھے ”کیا یہ وہی (پیغمبر موعود) ہے؟“

والد نے جواب دیا ”ہاں“۔ اس پر چچا نے دریافت کیا ”پھر اس

کے لیے تمہارے دل میں کیا جذبہ ہے؟“ والد نے کہا ”دشمنی ہی

دشمنی۔۔۔ جب تک زندہ ہوں، خدا کی قسم!“

یہ تھا یہود کا اصل ذہن! یعنی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے

سامنے آنے والا داعیِ حق ہے۔ خدا کا پیغام لانے والا ہے۔

اس کا ہر بول اس کی سچائی پہ گواہ ہے، اس کا پورا کردار اس کے

مرتبہ کو نمایاں کررہا ہے، اس کا چہرہ اور اس کی وجاہت اس کی

نبوت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ سمجھتے ہی نہیں خلوتوں میں زبان

سے اقرار تک کرتے ہیں لیکن ایمان و اطاعت کی راہ اختیار

کرنے کی بجائے مخالفت اور عداوت کا عزم باندھتے ہیں۔ یہ

فطرت یہود کے ہاں عام تھی، آفتاب نکلتا ہے تو کون نہیں جانتا

کہ طوفانِ نور اُمڈ پڑا۔ آدمی اور حیوانات تو خیر آنکھیں رکھتے

ہیں۔ گھاس کی ایک ایک پتی کو علم ہو جاتا ہے کہ وہ ہونے والا

واقعہ ہو گیا جو ہر شب تیرہ کے خاتمے پر روز ہوا کرتا ہے بلکہ

حرارت اور گرمی مٹی کے بے جان ذروں اور پانی کے قطروں اور

ہوا کی موجوں تک کو یہ معرفت دیتی ہیں کہ نور کا پیغامبر جلوہ آرا

ہو چکا۔ طلوعِ آفتاب تو ایسا بڑا انقلابی واقعہ ہوتا ہے کہ اسے

چمگادڑیں اور اُلو تک جان لیتے ہیں۔ ان کی فطرت کی کی
امتیازی شان بس یہ ہوتی ہے کہ روشنی ہونے پر اور دنیا کی تو
آنکھیں کھلتی ہیں اور ان کی آنکھیں بند ہو جایا کرتی ہیں بلکہ ان
کے لیے سورج کے نکل آنے کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان کی
آنکھیں چندھیا کے رہ جائیں۔ انسان اتنا اندھا نہیں ہو سکتا کہ
اس کے سامنے کے انبیاء مرتبۂ اعجاز کو پہنچے ہوئے علم و کردار کے
ساتھ جلوہ گر ہوں اور وہ یہ نہ محسوس کر لے کہ کوئی عظمت مآب
اور غیر معمولی اہمیت کی شخصیت ابھری ہے۔ آدمی دیکھتا ہے،
سمجھتا ہے جانتا ہے اور جاننے کے بعد آنکھیں بند کر لیتا ہے۔
پھر بھی اگر روشنی پپوٹوں کے پردوں کو چیر کر اندر جا پہنچتی ہے تو
آنکھوں پر پٹیاں باندھتا ہے۔ ہاتھوں سے ان کو بھینچ لیتا ہے۔
منھ ریت میں چھپا لیتا ہے کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند
کر کے کالے پردے ان پر ڈال دیتا ہے۔ کہتے ہیں سوتے کو
جگایا جا سکتا ہے۔ جاگتے کو جگانا ممکن نہیں ہوتا ٹھیک اسی طرح

انجام کو علم دیا جا سکتا ہے لیکن جاننے والے کو انجان بن جانے پر جہل کے عالم سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ ٹھیک یہی حال تھا جس میں یہود کی اکثریت اور خصوصاً ان کے علماء کبار جا پڑے تھے۔ قرآن نے بھی ان کے اس فساد کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم یعنی یہ حق اور داعی حق کو اسی قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

یہودیت کے سربراہ کار محسن انسانیت کے علو مرتبہ کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے اور جوں جوں عامۃ الناس اور ان کے اپنے ریوڑ کے افراد اس دعوت کی طرف لپک رہے تھے، ان کے دلوں کی فضا میں کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔

مناظرانہ سوالات

بگڑے ہوئے مذہب داروں کے دلوں میں جب کسی موثر دعوت اور کسی فروغ پاتی ہوئی تحریک اور کسی جلیل القدر داعی کے خلاف کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ تو ام پکڑ لیتا ہے تو وہ افہام و تفہیم کے دروازے بند کر کے مناظرے کا دنگل کا کھول دیتے ہیں۔ مناظرے کی اسپرٹ سے جو سوالات و شکوک اٹھائے جاتے ہیں ان کا منشا کبھی یہ نہیں ہوتا کہ ایک بات کو سمجھنا ہے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیدھی سادی بات کو سمجھ کے نہیں دیتا ہے یعنی مناظرے کی روح ہے "میں نہ مانوں" لیکن مقصد اتنا ہی نہیں ہوتا۔ وسیع تر منتہا یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کو طلب حق کی فطری راہ سے ہٹا کر شکوک و شبہات کے خارزاروں میں ڈال دیا جائے اور وہ سادہ استدلال سے دور ہو کر نظری سوالات کے چکر میں پڑ جائیں۔ وہ دعوت کی عقلی قدر و قیمت اور اس کے اخلاقی اثرات کو جانچنے کے بجائے پیچیدہ تکنیکل مسائل کو بھول

بھلیاں میں گھومتے رہیں۔ علمائے سُوء اپنے بارے میں تو سوفی صدی اطمینان رکھتے ہیں کہ ہمیں دعوتِ حق کبھی ختم نہیں کرسکتی، ڈراُنہیں ہوتا ہے اپنی بھیڑوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا۔ ان کی حفاظت کے لیے وہ ٹیڑھے سوالات کے جھاڑ کا باڑا بناتے ہیں۔ یہود کے علماءِ سوء بھی اس کے سوا اور کیا کرتے؟

عبداللہ بن سلام کے تحریک اسلامی میں شامل ہوجانے کے بعد یہود نے مناظرانہ بحثوں اور کاوشوں کے مورچے جمانے پر پوری توجہ صرف کردی اور کج بحثیوں کے ترکش کھول کر منطقیت کے تیر تحریک اسلامی پر برسانے شروع کردیئے۔ مگر یہ ساری جنگی کارروائی بھی کھلے مورچوں سے نہیں۔ منافقت کی ٹٹیوں سے جاری کی گئی۔ یہ بزرگانِ تقویٰ کیش حق پژوہی کے بڑے مرعوب کن بہروپ بھر کر تحریک اسلامی کے اجتماعات میں شریک ہوتے۔ پھر باتوں باتوں میں گربہ مسکینی کے طرز سے ہونٹ لٹکا لٹکا کر سوالات سامنے لاتے۔

ایک اجتماع میں حضور رسالت مآبؐ کے سامنے انھوں

نے یہ سوال رکھا: ''خلق کو جب خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو آخر

خود خدا تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟'' دیکھا آپ نے ذہن کا

ٹیڑھ! ----- یہود خود اسی خدا پر ایمان رکھنے کے دعوے دار

تھے۔ اس کے پیغمبروں کے معتقد اور اس کی کتاب کے علمبردار

تھے۔ وہ خدا کو پہلے سے جانتے تھے، اس کی صفات سے آگاہ

تھے لیکن اسی خدا کی طرف جب اسلام نے بلایا تو خدا کے

بارے میں ان کے دلوں میں بڑا بھاری اشکال پیدا ہو گیا اور ان

کے سوال کا گویا ظاہری مدعا یہ تھا کہ اگر اشکال رفع ہو جائے تو

پھر ان کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے لیکن سوال کا

ٹیڑھ بتا رہا ہے کہ مقصود طلب ہدایت نہیں بلکہ لوگوں کو ہدایت

سے بچنے کے لیے راہِ فرار دکھانا ہے۔ آنحضورؐ نے اس ٹیڑھے

سوال کا جواب بہت ہی سیدھے طریق سے دیا۔ یعنی سنجیدگی

سے سورۂ اخلاص پڑھ دی۔ ''کہو (اے محمدؐ) کہ اللہ ایک ہے، وہ

بے ہمہ ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور کوئی اس کا ہمتا نہیں ہو سکتا۔" (حیاتِ محمدؐ از محمد حسین ہیکل مصری)

آیئے آپ کو ایک اور دلچسپ مجلسِ گفتگو میں لے چلیں۔ یہود کے بعض نامور مولوی ایک دن حضورؐ کے حلقے میں آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے چار سوالوں کے جواب دیجیے، پھر ہم آپؐ کی دعوت مان لیں گے اور آپؐ کی اطاعت قبول کر لیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اب اس عہد کی ذمہ داری تم پر ہے پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے۔ سوالوں کے سامنے آنے سے قبل آپ ذرا خود اندازہ کیجیے کہ تحریک اسلامی کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے معقول لوگوں کی طرف سے کس قسم کے استفسارات کی توقع کی جانی چاہیے۔ وہ پوچھتے تو اساسی صداقتوں کے بارے میں پوچھتے، اسلام کی اخلاقی قدروں کے بارے میں پوچھتے، سیاسی و معاشی نظام اور اس کے طریق کار کے بارے میں پوچھتے،

مسلمان ہونے کے شرائط و لوازم کے بارے میں پوچھتے، اپنی زندگیوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے عملی مسائل کے متعلق پوچھتے، لیکن ان چیزوں سے وہاں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ انھوں نے اپنے علم و فراست کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ سوالات یکے بعد دیگرے پیش کیے۔

۱۔ بچہ ماں کے مشابہ کیوں ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے باپ کے نطفہ سے تشکیل پاتا ہے؟

۲۔ آپ کی نیند کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

۳۔ اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے کیا چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی تھیں اور کیوں؟ ان کسوٹیوں پر تحریک اسلامی کی حقانیت کو جانچا جا رہا تھا!

چوتھا سوال البتہ کچھ نہ کچھ تعلق براہ راست دعوت و تحریک سے رکھتا تھا، مگر اسپرٹ اس کی بھی ویسی ہی تھی، پوچھا

گیا کہ روح (فرشتۂ وحی) کیا ہے؟''

حضورؐ نے سکون سے ایک ایک سوال کا جواب دیا اور آخری سوال کے جواب میں فرمایا کہ تم خود اس بارے میں جانتے ہو کہ وہ جبرئیل ہے اور وہی میرے پاس آتا ہے۔

سب سوالات ہو چکے۔ جوابات سامنے آگئے۔ ان جوابوں میں سے کسی کی تردید نہیں کی گئی، بلکہ ہر ایک پر کہا گیا ''اللھم نعم!'' یعنی ''ٹھیک، اے ہمارے اللہ!''

آپ توقع کریں گے کہ ان جوابات کے بعد انہوں نے دلوں کے دروازے اسلام کے لئے کھول دیئے ہے، وہ ایک فرشتہ ہے کہ جب آتا ہے تو مصیبت اور خون خرابے کا پیغام لے کے آتا ہے''۔ مراد یہ تھی، کہ وہ جب خدا کی طرف سے دین کی علمبرداری کا مطالبہ لاتا ہے تو ایک کشمکش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے نقصانات سر پڑتے ہیں اور بڑے جہ

سے کھانے پڑتے ہیں بلکہ نوبت جہاد تک پہنچتی ہے اس سے ہماری نہیں بنتی۔ "بس اس فرشتے کی دشمنی آڑے نہ آئی ہوتی تو پھر ہم آپ کا ضرور ساتھ دیتے اور آپؐ کے نقش قدم پر چلتے"۔ یعنی دعوت ٹھیک، پیغام برحق، تحریک درست، مگر اس کے پس منظر میں جس فرشتے کو خدا نے لا ڈالا ہے اس سہاری صاحب سلامت ختم ہو چکی ہے لہذا جہاں وہ ہوگا وہاں ہم نہیں آسکتے!

اس کا جواب محسن انسانیتؐ نے قرآن کے الفاظ میں ایسا دیا کہ بس سننے والوں کو ہمیشہ یاد رہا ہوگا۔ فرمایا۔ "کہو (اے محمدؐ) کہ جو کوئی جبریلؑ کا دشمن ہو تو (وہ کان کھول کر سن لے کہ) قرآن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل پر اپنے فرمان کے تحت اتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے (عداوت اور مصیبت اور خون خرابے کا پیغام نہیں بلکہ) ذریعۂ ہدایت و بشارت ہے"۔

(سیرت ابن ہشام، جلد ۲۔ ص ۱۶۸۔۱۶۷)

ایک اور بحث پیدا ہوگئی۔ سرورِ عالمؐ نے کسی موقع پہ

حضرت سلیمان علیہ اسلام کا ذکر سلسلۂ انبیاء میں فرمایا۔ اس پہ

یہودی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا۔ ہر طرف کہا جانے لگا کہ "محمد

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی انوکھی بات سنی؟ کہتے ہیں کہ سلیمان بن

داؤد بھی پیغمبر تھے! خدا کی قسم، وہ تو محض ایک جادوگر (نعوذ

باللہ) تھے۔ چنانچہ قرآن نے اس واہیات چرچے کی تردید کی

کہ جادوگری تو ایک کافرانہ حرکت ہے اور حضرت سلیمانؑ نے

کبھی یہ حرکت نہیں کی۔ چاہ بابل کے جو قصے مشہور ہیں وہ تو

شیطان کے کرشمے تھے۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲۔ ص

(۱۶۸-۶۹

طوفان امڈ پڑا

تحریکِ اسلامی کے دورِ اوّل میں یہود بہت سے ایسے

پہلو دیکھ رہے تھے جن کی بناء پر ان کو یہ آس لگی رہی کہ آہستہ

آہستہ یہ تاریخی طاقت ہمارے ہاتھ میں آ جائے گی۔ قرآن میں

بنی اسرائیل کی جہانی فضیلت کا ذکر تھا...... انی فضلتکم علی

العلمین ...... ان کے انبیاء کی نبوت کی تصدیق تھی، ان کی

کتاب مقدس کی حقانیت کی گواہی تھی۔ ان کے سامنے تعالوا

الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم کی اسپرٹ سے دین کی

مرکزی حقیقت کو اجاگر کیا جا رہا تھا۔ حضور سرورِ عالمؐ مشرکین کے

طور طریقوں کے مقابلے میں یہود کے بعض طریقوں کو پسند

فرماتے۔ مثلاً مشرکین بالوں میں مانگ نکالتے تھے اور یہود نہیں

نکالتے تھے۔ سو آپؐ نے اس معاملے میں مشرکین کی مخالفت کی

اور یہود کی موافقت! جن معاملات میں قرآن میں کوئی حکم اللہ

تعالیٰ کی طرف سے وارد نہیں ہوتا تھا ان پر نبی اکرمؐ اہلِ کتاب

کی موافقت کرتے۔ (بخاری، کتاب اللباس) مدینہ کے

یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے بھی اس دن روزہ

رکھا اور مسلمانوں کے لئے عاشورا کا روزہ رکھنا پسند فرمایا۔ کسی

یہودی کا جنازہ گذرتا تو آپ کھڑے ہوجاتے۔ سب سے بڑھ

کر یہ کہ مسلمانوں کے لئے قبلہ نماز بیت المقدس تھا۔ یہ ایک کھلی

ہوئی علامت تھی کہ تحریک اسلامی مشرکین کے مقابلے میں اہل

کتاب سے زیادہ اقرب تھی۔ امر واقعہ درحقیقت یہ تھی کہ

یہودیت کا قالب تو اس مذہب کے مفاد پرست مولویوں اور

پیروں نے پوری طرح مسخ کر ڈالا تھا اور یہ قالب بے جان بھی

ہو چکا تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام جس دین کو لائے تھے وہ وہی

اسلام تھا جسے سارے ہی انبیاء نے شرائع کے تھوڑے بہت

تفاوت کے ساتھ پیش کیا تھا اور اب اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا

کے سامنے رکھ رہے تھے بلکہ ایک نظام کی صورت میں برپا

کر رہے تھے۔ یہی رشتہ تھا جس کی بناء پر حضور کو بھی امیدیں

تھیں کہ یہود اسلامی جدوجہد کو جوں جوں سمجھیں گے۔ اس کا

خیر مقدم کریں گے اور اس کام کو اپنا کام سمجھیں گے انہیں خوشی

ہوگی کہ خدا کے نام کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے۔ اور انبیاء کے دیئے

ہوئے اصول اخلاق نظام زندگی کی بنیاد بن رہے ہیں اور
شریعت تورات کی اصل قدروں کے بجھے ہوئے دیئے از سر نو
روشن کیے جا رہے ہیں۔ انہی امیدوں کی فضا میں قرآن نے
اپنی دعوت یوں پیش کی تھی کہ اصل سوال گروہ بندیوں کا نہیں
اصول و عمل کا ہے۔ یہودیوں میں سے، عیسائیوں میں سے،
صابیوں میں سے اور خود اسلام کے نام لیواؤں میں سے جو کوئی
فی الحقیقت خدا اور اس کے قانون اور اس کے انبیاء کی دعوت اور
محاسبۂ روز جزاء پر ایمان لائے اور پھر اپنی زندگی کو عمل صالح
بنا کے دکھا دے تو بس یہ چیز ہے جو مطلوب ہے۔ اصل چیز نام
نہیں، کام ہے۔ مطلوب چھپے نہیں، کھرا مال ہے۔ مقصود نسبتیں
نہیں، سیرتیں ہیں۔ مسئلہ کسی دھڑے اور جتھے کے مفاد کا نہیں،
انسانیت کی مشترک خیر و فلاح کا ہے۔ لیکن نہ یہودیوں کی
طرف سے تحریک اسلامی کی امیدیں پوری ہوئیں، نہ تحریک
اسلامی کی طرف سے یہودیوں کی مرادیں بر آئیں۔

اور یکا یک تحریک اسلامی ایک انقلابی موڑ مڑ گئی۔ یہ موڑ تھا تحویل قبلہ کا واقعہ! تحریک اسلامی کی بنیادی فطرت ہر دور میں یہ رہی ہے کہ وہ اپنے امتیازی وجود کو نمایاں رکھنا چاہتی ہے اور اپنے افراد کے اندر اصولی و اعتقادی خودی کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ مکہ میں اسی تقاضے کے تحت بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا تاکہ نظریہ اسلامی کی علمبردار جماعت کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس ہو۔ چنانچہ ہجرت تک کے لمبے دور میں مسلمانوں نے مشرکین کے مقابلے میں اپنی مختلف حیثیت کا پوری طرح احساس کر لیا اور خود مشرکین کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اور مسلمان دو الگ الگ سمتوں میں حرکت کرنے والی طاقتیں ہیں۔ اسی شعور و احساس کی تکمیل تھی۔ جس کا اظہار "لکم دینکم ولی دین" کے مختصر سے قرآنی بول میں کر دیا گیا۔ بات پوری طرح نتھر گئی کہ تمہاری راہ الگ، ہمارا راستہ جدا۔ ہم میں تم میں کوئی جوڑ میل نہیں۔

اب مدینہ میں آ کر جو کچھ بھی اندیشہ والتباس تھا وہ اہل کتاب سے تھا اور اب اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریک اسلامی کو اہل کتاب کی بے روح مذہبیت سے ممیز رکھا جائے اور مسلم معاشرے کو یہودی معاشرے میں ذہنی طور پر تحلیل ہونے سے بچایا جائے۔ اب دور مکہ کی وہ ضرورت ختم ہو چکی تھی جس کے تحت بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ بنایا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ذہنی رابطہ قبلہ ابراہیمی ہی سے قریب تھا اور حضورؐ خود اسی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور تحریک کے اولین جانباز بھی بنو اسماعیل سے تعلق رکھتے تھے۔ امتیاز کا وہ عارضی اہتمام اب غیر ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ کا قلب حقیقت شناس پہلے سے اس تبدیلی کا منتظر رہا اور اس کا ذکر خود قرآن میں ہے کہ قد نری تقلب وجھک فی السمآء۔

تحویل قبلہ کا فرمان صادر کر کے درحقیقت سلطنت زندگی کے فرمانروائے حقیقی نے جہانی امامت کے منصب سے

بنی اسرائیل کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ ملت اسلام کو مامور فرمایا۔ عالمی دعوت خیر و فلاح کا جو مرکز پہلے بیت المقدس میں چلا آ رہا تھا۔ وہ اب حرم کعبہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو امت وسط یعنی عالمی دعوت کا مرکزی گروہ قرار دیا گیا جس پر شہادت علی الناس کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ اور تمام بنی نوع انسانی کی رہنمائی کا فریضہ عائد کیا گیا۔

سولہ مہینے تک مدینہ میں بیت المقدس کے رخ نماز ادا کی جاتی رہی۔ رجب یا شعبان ۲ ھ کا واقعہ ہے کہ ابن سعد کی روایت کے بموجب سرور عالم ؐ بشر بن براء ابن معرور کے ہاں دعوت پر گئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپ ؐ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعہ یہ آیت نازل ہوئی کہ فلنولینک قبلۃ ترضھا فول وجھک شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ کہا گیا

کہ لو ہم تمھیں اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ سو (اب) مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو اب جہاں کہیں بھی تم ہو اسی کی طرف منھ کر کے نماز پڑھا کرو۔

اس حکم کے سنتے ہی خدا کا سب سے زیادہ اطاعت شعار بندہ حالت نمازہی میں رخ بدل لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا اتباع کرنے والے تمام نمازی نئے قبلہ کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ بیت المقدس مدینے سے سیدھا شمال میں ہے اور مکہ جنوب میں۔ حالت نماز میں قبلہ کی تبدیلی کے معنی یہ ہوئے کہ امام کو مقتدیوں کے سامنے سے سیدھا پیچھے کی طرف آنا پڑا ہوگا اور نمازیوں کی صف کو بالکل الٹے قدموں گھومنا پڑا ہوگا۔ اس کے بعد مدینہ اور آس پاس کی بستیوں میں عام منادی کرادی گئی۔ براء بن عازب کا بیان ہے کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے اور وہ اعلان سنتے ہی اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ انسؓ بن مالک کی

روایت ہے کہ بنی سلمہ کے ہاں یہ اطلاع دوسرے روز نماز صبح کے دوران میں پہنچی لوگ ایک رکعت پڑھ کر دوسری میں تھے کہ منادی کی پکار سنی اور اسے سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رخ بدل لیا۔ (تفہیم القرآن جلد ۱۔ صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱)

اس تبدیلی پر جو ہنگامہ بپا ہونے والا تھا اس کے بارے میں پہلے سے قرآن نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا۔ سیقول السفهآء من الناس ماولھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا۔ یعنی نادان اور حقیقت ناآشنا لوگ قیل وقال کا طوفان اٹھادیں گے کہ ان لوگوں نے کس سبب سے قبلہ اول بدل ڈالا ہے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوں گی۔ عجیب وغریب ذہنی ردعمل رونما ہوں گے اور تعلقات وروابط پر بڑا اثر پڑے گا۔ مسلمانوں کو پروپیگنڈے کے آنے والے طوفان میں مضبوط موقف لے کر کھڑے رہنے کے لئے قرآن نے تحویل قبلہ کی معنویت کی پیشگی ان کے ذہن نشین کرا دیا۔ انہیں بتایا کہ پہلے

بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی غرض یہ تھی کہ عربیت کے بت کو توڑ
اجائے کیونکہ عرب اپنے قومی دائرے سے باہر کسی چیز کی قدر
ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف
رخ گھما دینے کا مدعا یہ ہے کہ اسرائیلیت کا بت بھی ٹوٹ
جائے۔ ایک کام پہلے ہو چکا تھا۔ دوسرا اب کر دیا گیا۔ عربیت
کے پرستار پہلے چھٹ چکے تھے۔ اور اسرائیلیت کے پرستار اب
چھٹ جائیں گے۔ اس طرح نفاق کے گھن سے نیا اسلامی
معاشرہ پاک ہو سکے گا۔ اب اس حلقہ وہی لوگ رہیں گے جن کی
نگاہ میں اصل احترام اللہ کے فرمان اور اس کے رسول کی سنت کا
ہے۔ یہ موڑ جس سے تحریک اسلامی گذر رہی ہے۔ رسولؐ کا
دامن پورے اعتماد کے ساتھ تھام کر چلنے والوں کو ان تمام بے
اصول افراد سے چھانٹ کر الگ کرے گا جو اس حقیقت پر ایمان
رکھتے ہوں کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں اور اصل مرکز
اطاعت وہ ہے۔ نیز جو اس نکتہ کے رازداں ہیں کہ نیکی مشرق یا

مغرب کی طرف رخ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ان ظاہری اشکال شریعت کے اندر کام کرنے والی جس روح کا نام نیکی ہے۔ وہ اللہ پر یوم آخرت پر فرشتوں پر، خدا کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر، ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا ہے۔ سو تمہیں قبلہ کے ظاہری شعار کو قائم کرنے میں جس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے وہ ہے "استبقوا الخیرات" یعنی نیکیوں کی طرف لپکو اور بھلائیوں کی طرف رخ کرو۔ تمہیں چاہیے کہ تم خدا کے بڑے سے بڑے تغیر آفریں اور انقلاب انگیز حکم کی تعمیل کرنے میں کسی مخالف طاقت سے نہ ڈرو۔ صرف اسی ایک سے ڈرو۔ اس کا مطالبہ ہے کہ "فلا تخشوھم واخشونی"۔

قرآن نے حاکم کائنات کا فرمان سناتے ہی کہہ دیا ہوگا کہ یہ واقعہ بجز اہل ایمان و یقین کے اور ہر کسی پر شاق گذرے گا۔ اس پر جب ہنگامہ کھڑا ہوگا تو گھبراہٹ چھا جائے گی اور گلی گلی اور کوچے کوچے بحثیں شروع ہوں گی کہ کمزور لوگوں کے سر چکرا

جائیں گے اور جذبات میں ایک ہل چل مچے گی۔ اب سنئے کہ قیل وقال کیا کچھ ہوئی۔

مشرکین نے کہا کہ دیکھئے اب ہوش کچھ تو ٹھکانے آیا۔ ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے تو آہستہ آہستہ یہ لوگ ہمارے مذہب کی طرف بھی از خود لوٹ آئیں گے۔

یہود نے کہا کہ داعیٔ اسلام نے ہماری مخالفت کے جوش میں قبلۂ انبیاء کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ اگر یہ نبی ہوتا تو کبھی بھی اس قبلہ کو نہ چھوڑتا۔

نفاق کے مریض کہتے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا صحیح قبلہ کدھر کو ہے، اگر پہلا قبلہ برحق تھا تو اب وہ چھوڑ دیا، اور اگر اب دوسرا قبلہ درست ہے تو پہلے جو کچھ تھا، وہ غلط تھا۔ قبلہ کیا ہوا کھیل ہو گیا۔ جدھر جی چاہا ادھر رخ کر لیا۔ یہ تو سارا مذہب ہی بس مرضی کا کھیل ہے۔

اور جو لوگ ایمان و یقین کی روح سے مالا مال تھے انہوں نے کہا کہ ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت قبول کی اور ہم اس پہ ایمان لائے۔ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے۔ (زاد المعاد، جلد ۲۔ ص ۵۷۔۵۸)

یہی اہل ایمان بچارے پروپیگنڈہ کی آندھی میں گھر گئے اور چاروں طرف سے سوالات، بحثوں اور طنز و تضحیک کے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ مجلس مجلس معرکہ آرا گفتگوئیں تھیں، گلی گلی باڑھ ہو رہی تھی۔ لحہ لحہ جذباتی ہیجان پیدا ہوتے تھے۔ انقلابی تحریکوں میں ہر بڑی تبدیلی اور ہر بڑے موڑ پہ اور لوگوں کے خیالات کے بتوں کو توڑنے والے ہر اقدام پہ اس طرح کے طوفانی ہنگامے پیش آجاتے ہیں اور ایسے حالات میں ان کے کارکن گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہوکر بسا اوقات اشتعال کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔

اس اندیشے کے پیش نظر نصیحت کردی گئی کہ ان

گرداہوں کو پار کرنے کے لئے صبر وصلوٰۃ کے مضبوط سفینے ہی کار

آمد ہو چکے ہیں۔ مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کے بارے

میں بتایا گیا کہ ان کا مقصود تلاش حق ہرگز نہیں ہے اور یہ دلائل

سے مطمئن ہونے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کے سوالات کا مدعا

محض پریشان کرنا ہے۔ یہ اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے۔

جب تک کہ تم لوگ اپنا اصول اور نظام چھوڑ کر ان کی مریدی نہ

اختیار کرلو۔

بیہودہ نکتہ طرازیوں کے جواب میں اتمام حجت کے طور

پر تحریک اسلامی کی طرف سے سنجیدہ و متین انداز سے زوردار

استدلال کیا گیا اور عوام الناس کے سامنے کعبہ کی عظمت کو سورۂ

آل عمران کے ایک خطاب میں واضح کردیا گیا۔ ارشاد ہوا:

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسان کے لئے تعمیر ہوئی

وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے اس کی خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لئے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ابراہیمؑ کا مقام عبادت ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس کے حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے"۔ (آل عمران: ۹۶-۹۷)

بیت المقدس کے متعلق یہ حقیقت خود بائبل سے ثابت تھی کہ اسے حضرت موسیٰ کے ساڑھے چار صدیاں بعد حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا اور دور سلیمانی ہی میں اسے خدا پرستوں کا قبلہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس تاریخی اور مذہبی دونوں طرح کی متفقہ اور متواتر روایات سے یہ ثابت تھا کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے استوار کیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ موسیٰؑ کے

آٹھ نو صدیاں قبل ہو گذرے تھے۔ کعبہ کی زمانی اولیت کے

ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا کہ اس کے پر تقدس ماحول میں بڑی اہم

نشانیاں ہیں۔ اس میں دین کی بیش قیمت روایات جگمگا رہی

ہیں۔ نیکی کے علمبرداری کی ایک تاریخ اس کے سنگ و خشت پر

مرقوم ہے۔ پھر اس میں ابراہیم علیہ اسلام کی جائے عبادت واقع

ہے جس کے سرچشمہ سے آج بھی ذوق توحید سیراب ہو سکتا

ہے۔ پھر اس مرکز عبادت کا مقبول بارگاہ حق ہونا اس آیت بینہ

سے آشکارا ہے کہ لق و دق صحرا میں تعمیر ہونے والی اس عمارت

کے آس پاس ایک انسانی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اور اس کی طرف

لمبے لمبے فاصلے طے کر کے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ پھر اس

کے علو مرتبہ کے روشن دلیل یہ ہے کہ بے آب و گیاہ وادی کے

آباد کاروں کے پاس ہر طرح کا رزق از خود پہنچ رہا ہے اور سب

سے بڑھ کر یہ کہ عرب کے جنگ جو بدوی معاشرے کے طوفانی

سمندر میں یہ گھر چار ہزار برس سے ایک جزیرۂ امن بنا کھڑا

ہے۔ جو کوئی اس کے دائرہ حرمت میں داخل ہو جاتا ہے اس کے جان، مال اور آبرو کو تحفظ مل جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اس کے سائے میں آ کر تلواریں نیام میں کر لیتے ہیں، اور جذبات کی باگیں تھام لیتے ہیں۔ قاتل اور ڈاکو اس کی فضاء میں سانس لیتے ہی امن پسند شہریوں میں بدل جاتے ہیں۔ سو اس گھر کا حق تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا علم بلند کرنے والی تحریک کا روحانی مرکزی قرار پائے۔ اس میں دین و عقل کے خلاف آخر کون سی بات واقع ہوئی ہے کہ اس پر گلی گلی چہ میگوئیاں کی جارہی ہیں۔

اس استدلال کا اگر کوئی نتیجہ خیز تھا تو وہ صرف عوام کے لئے تھا۔ رہے یہود، سو انہوں نے تو تحویل قبلہ کے واقعہ کو مسلمانوں کی طرف سے ایک فیصلہ کن مخالفانہ اقدام قرار دیا جس کی وجہ سے ان کی وہ تمام امیدیں ختم ہو گئیں جو وہ مسلمانوں کے بارے میں دلوں میں باندھے بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا

کہ یہ طاقت سستا شکار نہیں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر بھی

یہود کی نفسیات کے وہ تمام تاریک گوشے آشکار ا ہو گئے جن کے

ہوتے ہوئے وہ حسن ظن برقرار نہ رہ سکتا تھا جس کے ساتھ

تعلقات کا آغاز کیا گیا تھا۔ ان کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ میں بھی

تحریک کو بس اپنے ہی بل بوتے پر چلنا ہوگا اور مذہب وتقویٰ

کے کاروباری اجارہ داروں سے کسی تعاون وحمایت کی امید یں

باندھنا فضول ہے بلکہ الٹا یہ خطرہ آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا

کہ یہود کفار و مشرکین مکہ سے زیادہ گھناؤنے جذبات کے ساتھ

تحریک حق کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔ اس کے باوجود

حضورؐ اور آپؐ کے رفقاء نے تحریک کا طرز عمل داعیانہ اخلاق پر

استوار رہا اور جیسے کو تیسا کے اصول پر یہود اور دوسرے مخالفین

سے کوئی معاملہ نہیں کیا گیا۔ کج بحثیوں اور طنز و تضحیک اور چھچھور

پن پر مسلمان طرح دے جاتے۔ بات کرنی پڑتی تو مہذب اور

معقول طریق سے استدلال کرنے پر اکتفا کرتے اور زیادتیوں

پر عالی ظرفی سے صبر کرتے۔

بہر حال اب دلوں میں بھرا ہوا طوفان بند توڑ کر اٹھ پڑا۔

بدتمیزیاں اور بیہودگیاں

جو لوگ خود کوئی تعمیری نصب العین نہیں رکھتے وہ کسی تعمیری کام کو محض اس لئے نہیں ہونے دینا چاہتے کہ اس کی وجہ سے ان کا کھوکھلا پن دنیا بھر کے سامنے بے نقاب ہونے لگتا ہے۔ یہی صورت یہود کی تھی۔ وہ صدیوں سے مدینہ کے ماحول پر چھائے ہوئے تھے لیکن کبھی وہ اس قابل نہ ہوئے کہ پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو بلندی کردار پر لا سکیں۔ لوگوں کے ذہنوں کا تزکیہ کر سکیں اور ان کے اخلاق سنوار سکیں، ان کو امن و سلامتی کا کوئی نظام دے سکیں۔ وہ گری ہوئی انسانیت کو تو کیا سہارا دیتے، خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ دنیا کا ہر روگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور وہ اپنے کسی

روگ کا درماں کرنے کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ اب جب ان کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی طاقت ابھری اور اس نے لوگوں کے دل و دماغ میں زندگی بخش اصول و اعتقاد کے چراغ جلانے شروع کیے۔ ان کے کردار کے کھنڈروں کو صاف کر کے تعمیر نو کا آغاز کیا، ایک مقدس نصب العین کے سانچے میں ڈھال کر افراد تیار کرنے اور ان افراد کے بل پر ایک نظام امن و عدل کی تاسیس کی مہم شروع کر دی تو یہود بھنا اٹھے اور اس تعمیری تحریک کو ناکام کرنے کی ہر گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کی۔ اس طرح کی منفی اور تخریبی طاقتیں جب کسی کی مخالفت پر کمر باندھتی ہیں تو شرافت اور معقولیت اور تہذیب کو اٹھا کے بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ نہایت کمینگی کے ساتھ بدتمیزیاں کرنا ان کی شان تقدس کو گوارہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بدتمیزیوں کا محاذ بھی کھول دیا گیا۔

ان جانشینان انبیاء اور علم برداران کتاب الٰہی اور مسند نشینان درس و افتاء نے بغض و عناد کے میٹھا نے سے جام کے

جام چڑھا کر جن کرتوتوں کا مظاہرہ کیا ان میں سے دو تین مثالیں یادگار رہیں گی۔ مذہب و تقویٰ کے یہ اجارہ دار جب حضور سرور عالمؐ سے ملتے تو "السلام علیک" کہنے کے بجائے زبان کو ذرا گھما کر السلام سے حرف لام کو غائب کر دیتے۔ یعنی "السام علیک" کہا کرتے۔ اس کلمہ کے معنی یہ تھے کہ اے مخاطب! تجھ پر موت وارد ہو۔ یہ سلوک کیا جا رہا تھا۔ اس جلیل القدر ہستی سے جو ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور یعقوبؑ اور یوسفؑ اور اسحٰقؑ اور اسمٰعیل علیہم السلام ہی کے پیش کردہ پیغام کی تجدید کے لئے سرگرم عمل تھی، جو تورات کی اصل روح کی تجدید میں منہمک تھی، جو شریعت الٰہی اور قانون آسمانی ہی کے احیاء کے لئے محو جہاد تھی بلکہ کہنا چاہئے کہ جو دراصل یہود کے فراموش کردہ فریضہ کو ادا کر رہی تھی اور انہی کا چھوڑا ہوا کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ تقدس مآبانِ مدینہ پیغمبر حق کے گھر پر آئے تو غنڈوں اور کمینوں کا سا یہی فقرہ استعمال کیا۔ اس بدتمیزی پر حضرت عائشہؓ نے پردے

کے پیچھے سے تحت ردعمل دکھایا۔ وہ غصے میں جواب دیے بغیر نہ رہ سکیں اور کہہ اٹھیں کہ "تم پر موت وارد ہو۔ سرور دو عالمؐ کے کان میں یہ آواز پڑ گئی۔ آپؐ نے ام المومنین کو سمجھایا: "عائشہ! نرمی سے کام لو!" حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: "کچھ آپؐ نے سنا بھی انہوں نے کیا کہا تھا؟" فرمایا: "سنا تو تھا لیکن میں نے بھی "وعلیک" کہہ دیا، یہ کافی ہے!"

بدتمیزی کی، اور شرمناک مثالیں جن کا ریکارڈ قرآن نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا، ملاحظہ ہوں:

ایک یہ کہ بزم رسالت میں یہ اجارہ داران تقویٰ رونق فروز ہوتے اور دوران گفتگو میں جہاں کہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ذرا ٹھہریے، ہمیں بات سمجھنے کا موقع دیجئے تو اس موقع پر ایک ذو معنی لفظ استعمال کرتے۔ کہتے: "راعنا"۔ اس لفظ کا ظاہری مطلب تو وہی تھا کہ ہماری کچھ رعایت

فرمائیے، ہماری بات سن لیجئے، ہماری جانب توجہ دیجئے۔ مگر دوسری طرف عبرانی زبان میں اس سے ملتا جلتا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا تھا کہ ''سن تو بہرا ہو جائے۔'' علاوہ ازیں عربی زبان میں قریبی مادوں سے اس کے ہم صورت الفاظ ایسے موجود تھے جن سے معانی سنو نکلتے تھے مثلاً رعت۔ رعا سے ایک لفظ تھا'' الرعاع'' جس کے معنی تھے'' سفلۃ الناس'' اس کو رعاعنا کی شکل دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اسی طرح رعن۔ ورعن ورعن میں جاہل اور بے عقل ہونے کے معنی پائے جاتے تھے۔ ذرا سا زبان کو اور لچکا کر اسے ''راعینا'' بھی بنایا جا سکتا تھا اور اس صورت میں معنی ہوتے'' اے ہمارے چرواہے''، ''اے ہمارے گڈریے!'' یہ مختلف صورتیں تھیں جنہیں حضرات یہود باں ہمہ جبہ و دستار کسی صورت بنا بنا کر اختیار کرتے تھے۔ عوام بیچارے بھلا لغت و ادب کے اتنے ماہر کہاں ہو سکتے تھے۔ یہ علمائے کرام ہی قدر رکھتے تھے جو گھروں سے خوب تیاری

کر کر کے آتے کہ آج کیا کیا بدتمیزیاں کی جانی چاہئیں۔ ان ہستیوں میں سے کم سے کم ایک، یعنی رفاعہ بن زید بن تابوت کے متعلق تو تاریخ میں واضح روایت محفوظ ہے کہ اخلاق و شرافت کی اس شاندار مثال کے قائم کرنے میں اس یہودی مولوی نے بھی حصہ لیا تھا۔ یعنی ظاہراً دیکھئے تو بڑی شائستگی تھی لیکن دلوں کی گہرائیوں میں اتریئے تو اندر غنڈوں کی سی نفسیات کام کر رہی تھیں۔ آپس میں جانتے تھے کہ ہم وقت کی ممتاز شخصیت کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اگر کوئی ٹوک دیتا تو ارشاد فرماتے کہ "واہ ہمیں تم نے بدتمیز سمجھا ہے، ہم تو ادب و احترام کے ساتھ عرض کر رہے ہیں کہ ذرا ہمیں سمجھنے سمجھانے کا موقع دیجئے۔"

دوسری یہ کہ دوران گفتگو میں محسن انسانیت کو اکثر یہ جانشینان انبیاء ورسل یوں خطاب کرتے: "اسمع غیر مسمع" اس کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ ذرا سنئے۔ آپ کا

احترام اس میں مانع ہے کہ آپ کو کوئی بات آپ کی مرضی یا اجازت کے بغیر سنائی جا سکے۔ لیکن ان کی شرپسندانہ ذہنیت اس سے ایک اور مفہوم مراد لیتی۔ یہ کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم کو کوئی بات سنائی سمجھائی جائے اور یہ کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ، سننے کے قابل ہی نہ رہو۔

یہ گندا ذہن و کردار تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے کے لئے اٹھا تھا۔

تیسری یہ کہ اہل ایمان حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر جب کوئی ارشاد سنتے اور سمجھ لیتے تو ہدایت الٰہی کے تحت جذبہ صادق سے پکارا ٹھتے: " سمعنا و اطعنا " ہم نے ارشاد کو سن لیا اور ہم نے اس کی اطاعت اختیار کر لی لیکن حاملین تورات ایسے موقع پہ بڑی ڈرامائی حرکت کرتے۔ پہلے زور سے پکارتے " سمعنا " جی ہاں! ہم نے سن لیا ہے " پھر ذرا دھیمی آواز سے زبان کو لچکا کر

اطعنا کے بجائے عصینا کہتے "ہم نے تمہاری بات کو رد کر دیا۔ نافرمانی کا عزم کر لیا ہے۔ یہاں بھی وہی مشکل کہ کوئی گرفت کرتا تو تیوری چڑھا کر کہتے تم نے ہم لوگوں کو اتنا نامعقول سمجھ لیا ہے، مخالفت کے جوش میں آ کر ہم پہ ایسی گھٹیا حرکت کا الزام لگاتے ہو، تم میں اپنے سے باہر کے علماء اور بزرگوں کا احترام باقی نہیں رہا، اپنے علاوہ کسی کو تم شریف اور معقول ماننے پہ تیار نہیں ہو؟

غور فرمایئے کہ آخر اس طرح کی ذلیل حرکتوں سے کیا محسن انسانیتؐ کے پیغام میں کیڑے پڑ چلے تھے؟ کیا اس بازاری انداز گفتگو کے زیر اثر سچائی اور انصاف کی اسلامی تحریک کی قدر و قیمت ختم ہو سکتی تھی؟ کیا اس کمینگی کے زور سے اسلامی جماعت کا وجود مٹ چلا تھا؟ گالیاں دینے اور منہ چڑانے سے کسی تعمیری طاقت کا ایک بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس میں سارا مزہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مقابل کی جامد منفی اور

تخریبی طاقت کے دل کا بخار نکل جاتا ہے۔ یہ بزرگ جب بزم نبوت میں اس طرح کے کارنامے انجام دے کر رخصت ہوتے ہوں گے تو اپنی محفلوں میں جا کر فخر کرتے ہوں گے کہ آج تو بس ہم ان نبی صاحب کو یہ اور یہ کہہ آئے۔ مریدوں میں بیٹھ کر اپنی قابلیت کا سکہ جماتے ہوں گے کہ ہم نے لفظوں کے الٹ پھیر سے کیا کیا مطلب نکالے اور چسپاں کئے ہیں اور ہمارے صرف ونحو اور فصاحت وبلاغت کے علم نے اس معرکے میں ہمیں کتنی مدد بہم پہنچائی ہے۔

بزرگان یہود کے ان کارناموں میں عبرت کا درس یہ ہے کہ مذہبی لوگ جب انحطاط کا شکار ہوتے ہیں تو ان میں تحریف کلمات کی گندی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے ان کے اندر سے انسانیت، شرافت اور تہذیب کے تقاضوں کا لحاظ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے ان کی حرکات کے ظاہر و باطن میں شرمناک تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھے انہیں ایک طرح کی

بزدلی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سیدھے طریق سے دل کے گندے جذبات کو اگل بھی نہیں سکتے۔ بلکہ اپنی بد طینتی پر شرافت کی جعلی جھلیاں چڑھا چڑھا کر لاتے ہیں۔ یہ ایسی علامات ہیں جو کسی ذہن و فکر کے فاسد ہونے کی قطعی دلیل ہوتی ہیں۔ علی الخصوص بدزبانی اور بازاری انداز خطاب جہاں بھی پایا جائے، وہاں حق اور انصاف اور سچائی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ آدمی کا ہر ہر بول اور اس کا انداز گفتگو اس کی سیرت کا اسی طرح ترجمان ہوتا ہے جس طرح کھانے کی کسی دیگ میں سے اس کی خوشبو پھیل کر دور دور تک کھانے کی نوعیت اور اس کے مسالوں کے معیار کا اعلان کر دیتی ہے۔ اب اگر کسی دل و دماغ کی دیگ سے بدزبانی اور بدتمیزی کی سڑاند اٹھی رہی ہو تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے اندر پاکیزہ خیالات اور شریفانہ جذبات کی ترکیب پا کر کوئی اعلیٰ سیرت پک رہی ہو گی۔ جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ اختلاف کرنے والوں کے خلاف

بدزبانی اور بدتمیزی کی سطح پر اتر آیا ہے تو سمجھو کہ یہ اس کے مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہار چکا اور اخلاق کے مقابلے میں بھی شکست کھا چکا۔ اب یہ ہارا ہوا کھلاڑی محض دل کا بخار نکال رہا ہے اور دل کا بخار نکالنے والی طاقتیں تاریخ میں کوئی اثر نہیں پا سکتیں۔ وہ بس دل کا بخار نکالتی رہتی ہیں اور تعمیری دعوتوں کے قافلے گام بہ گام آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اتنے ہی پر بس نہیں ہو جاتی، مدینہ میں جب اذان کی ابتدا ہوئی تو چونکہ یہود کے روایتی مسلک کے خلاف یہ بھی نظام مذہب میں ایک بدعت تھی، لہٰذا وہ اس پر بھی بڑا پیچ و تاب کھاتے۔ خصوصاً وہ دیکھ رہے تھے کہ اذان کے کلمات اسلام کی پوری کی پوری انقلابی دعوت اور اس کے بنیادی نظریے کو جامعیت سے سامنے لے آتے ہیں اور دن میں پانچ مرتبہ ان کا پکارا جاتا اور اونچی اور خوش آئند آواز میں پکارا جاتا، ایک موثر ذریعہ نشر و اشاعت ہے۔ یہ آواز ان کی عورتوں، ان کے بچوں

اوران کے غلاموں کے کانوں میں پڑتی ، ہر روز پڑتی اور پانچ پانچ بار پڑتی ۔ تصور کیجئے کہ جب یہ انوکھی آواز بلالی سوز و ساز کے ساتھ گونجتی ہوگی تو مدینہ کی ساری فضاء میں سناٹا چھا جاتا ہوگا ۔ اپنوں پرایوں کے دل متوجہ ہو جاتے ہوں گے ۔ خصوصاً ان کو وہ فرق محسوس ہوتا ہوتا جو گھنٹے اور ناقوس بجانے اور اذان پکارنے میں تھا اور جس کے بارے میں خود ان کے عوام بھی کچھ نہ کچھ احساس کرتے ہوں گے ۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز بس آواز تھی ۔ اس میں نہ لفظ تھے نہ معنی تھے ۔ بخلاف اس کے اذان کی آواز چند بولوں اور چند کلموں پر مشتمل تھی ، جن میں عام فہم معانی موجزن تھے ۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز میں انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا لیکن اذان کی پکار میں انسانی قلب کا سوز و گداز کار فرما ہوتا تھا ۔ اس فرق کو محسوس کر کے یہود بجائے اس کے کہ یہ اعتراف کر لیتے کہ اذان فی الواقع عبادت کی دعوت دینے کا بہتر اور موثر ذریعہ ہے اور اس کے کلمات قدرو

قیمت رکھتے ہیں۔ وہ چڑ میں مبتلا ہو گئے۔ اپنی مجلسوں میں، صحبتوں میں وہ اذان پکارنے والے کی آواز کو عجیب و غریب تشبیہیں دیتے۔ وہ نقلیں اتارتے اور اذان کے کلمات کو بگاڑ بگاڑ کر سامان تضحیک پیدا کرتے۔ حسد اور کینہ ان مذہب داروں کو بھانڈوں کی سطح تک جا گراتا تھا مگر جو کام اذان کر رہی تھی، اس کی روک تھام تضحیک اور نقالی اور بھانڈپن سے کیونکر ہو سکتی تھی۔

بدتمیزیوں کی آخری حد یہ تھی کہ خود اللہ میاں کو بھی (نعوذ باللہ) نشانہ بنالیا گیا۔ مثلاً جب یہ آیت اُتری کہ "من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا" یعنی کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے تو بجائے اس کے کہ اس کے سیدھے اور صاف مفہوم کو اخذ کیا جاتا، یہود نے یہ کہہ کر مذاق اڑانا شروع کیا: "لوگو! سنتے ہو! اب تو اللہ میاں بھی قلاش ہو گئے ہیں، لو اب وہ بندوں سے قرض مانگنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔" خدا

سے بے خوفی اور بے شرمی کی اس سے زیادہ ناپاک مثالیں کم ملتی ہیں۔

اسی طرح قرآن میں جہاں مکھی اور مچھر یا ایسی ہی بظاہر حقیر چیزوں کا بطور مثال تذکرہ ہوا ہے اور ان کے وجود سے کوئی استدلال کیا گیا ہے۔ وہاں یہ لوگ طنز و تحقیر کا طوفان مچانے کا موقع پا لیتے، کہتے کہ ان مسلمانوں کا خدا بھی عجیب ہے کہ جسے مثال دینے کیلئے بھی ملتی ہیں تو ایسی حقیر چیزیں ملتی ہیں۔ اس کا استہزاء میں یہ استدلال بھی شامل ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کے اندر ان گھٹیا چیزوں کا تذکرہ ہے۔ ان لوگوں کو کیا خوب جواب ملا کہ:

"ہاں! اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیل دے۔ جو لوگ حق بات کے قبول کرنے والے ہیں۔ وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے، جو ان

کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انہیں سن کر کہنے لگتے کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟''
(البقرہ:۲۶)

مضحکہ انگیز مطالبہ

یہود کی بدتمیزی طلب حجت کی شکل اختیار کر کے ایک عجیب مضحکہ انگیز مطالبہ بن گئی۔ حضورؐ سے کہنے لگے :''لولا یکلمنا اللہ'' (البقرہ:۱۱۸) آخر یہ کیا جھمیلا ہے کہ خدا تمہاری طرف ایک فرشتہ در پردہ بھیجتا ہے اور بالا بالا ہی تم تک اپنی بات پہنچا دیتا ہے۔ کیوں نہیں وہ سامنے آ کر ہم سے براہ راست بات کرتا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ وہ زمین پر اترے، آنکھوں سے دکھائی دے اور ہم سے رو در رو کہے کہ یہ اور یہ میرے احکام ہیں، ان کو مانو اور یہ شخص میرا پیغمبر ہے۔ اس کا دامن تھام کر چلو۔ یہ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی کرے کہ کوئی صریح

اور قاطع نشانی بھیج دے جس کے بعد کسی کو مجال انکار نہ رہے کہ تو اس کے نبی ہو اور قرآن اس کا کلام ہے۔

یہ قاطع نشانی بھی انہوں نے متعین صورت میں بتا دی جو ان کو مطمئن کر سکتی تھی۔ تاریخ و سیرت کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ یہود کے حلقوں میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ دیر تک اس کا چرچا رہا اور بار بار یہ آپؐ کے سامنے دہرایا گیا۔

پہلے یہ بھی دیکھئے کہ یہ مضحکہ انگیز مطالبہ پیدا کیوں کر ہوا صورت واقعہ یہ تھی کہ مدینہ کے یہود حضورؐ کی بعثت سے قبل اوس اور خزرج کو زک دینے کے منصوبے بنا بنا کر آنے والے نبی کی فوری آمد کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ جب حضورؐ کی نبوت کا آفتاب طلوع ہو گیا تو یکایک انہوں نے پینترا بدل لیا اور انکار اور سرکشی کے مورچوں پر ڈٹ گئے۔ ان کی اس قلب

ماہیت پر عام لوگوں میں عجیب سی حالت استفہام پیدا ہوگئی۔ لوگ آ آ کر ان سے پوچھتے کہ یہ قصہ کیا ہے کہ پہلے آپ ہی حضرات یہ دعائیں مانگتے تھے اور ایک نبی کی آمد کا مژدہ سناتے تھے اور اب آپ خود ہی آنے والے کی آمد پر بگڑ بیٹھے ہیں۔ خصوصاً ایک مجلس میں معاذ بن جبل اور بشر بن براء بن معرور جیسے ذہین اکابر نے یہودی بزرگوں سے صاف کہا کہ "اے گروہ یہود! اللہ سے ڈرو اور سر تسلیم خم کردو، کیونکہ تم ہمارے خلاف تائید حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالٰی سے خود ہی بعثت محمدی کی آرزوئیں کیا کرتے تھے اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اہل شرک تھے اور تم ہی ہمیں یہ خبر سنایا کرتے تھے کہ وہ مبعوث ہو چکا ہے اور پھر تم اس کے اوصاف ہمارے سامنے گنوایا کرتے تھے"۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی گفتگوؤں میں کس بری طرح یہودی ذہن کا پول کھل جاتا ہوگا اور وہ خود محسوس کر لیتے ہوں گے کہ ہمارے متعلق مخاطبین کی رائے کیا ہے۔ اپنی شان

دیانت وتقویٰ کے بچاؤ کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ ایک نہ ایک ڈھال فراہم کرتے۔ وہ ڈھال کیا تھی؟ اسے معلوم کرنے کے لئے اوپر کی بات کا جواب سنئے جو بنی نضیر کے ایک بزرگ سلام ابن مشکم کی زبان مبارک سے صادر ہوا، فرماتے ہیں: "محمد اپنے ساتھ کوئی ایسی نشانی نہیں لایا جس کے ذریعہ ہم اسے بہ حیثیت نبی کے پہچان سکتے۔ لہٰذا یہ وہ شخص نہیں ہے جس کے بارے میں ہم تم سے تذکرہ کیا کرتے تھے"۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲، ص: ۴۔۱۷۳) یہی بات ابن صلوبا فطیونی نے خود محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست بھی کہہ دی تھی۔ یعنی ایک فیصلہ کن نشانی چاہئے تھی۔ اور اس کا تعین کرنا یہود کا کام تھا۔ وہ جیسی نشانی کا بھی چاہیں مطالبہ کریں۔ اسی طرح لوگوں کی طرف سے اس میثاق کا سوال اٹھایا گیا جو نبی آخر الزماں کے بارے میں سابق انبیاء سے انہوں نے استوار کیا تھا تو اس پر بھی ان لوگوں نے آئیں بائیں شائیں کر دی۔

مالک بن الضیف نے ایک بار صاف صاف کہہ دیا کہ "خدا کی قسم محمدؐ کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا۔" (سیرت ابن ہشام، جلد:۲، ص: ۱۷۴)

ان کے لئے قرآن کے پاکیزہ کلام اور ہل چل مچا دینے والے استدلال میں کوئی نشانی نہ تھی۔ محسن انسانیتؐ کے کردار میں کوئی نشانی نہ تھی، زندگی کا نقشہ بدلنے والی تحریک کی لہروں میں کوئی نشانی نہ تھی۔ علمبرداران حق کی پروان چڑھتی ہوئی جماعت میں کوئی نشانی نہ تھی، ان قربانیوں اور جانبازیوں میں کوئی نشانی نہ تھی جو مٹھی بھر مسلمان ظلم و تشدد کے ہتھیاروں سے کام لینے والی با اثر طاقتوں کے مقابلے میں دکھا رہے تھے۔ ان کو تو بس کوئی عجوبہ اور کوئی تماشا چاہئے تھا۔

اب سنئے کہ کس نشانی کا مطالبہ تھا!

رافع بن حریملہ اور وہب بن زید حضور سرورِ کائناتؐ کی

خدمت میں آئے سب باتیں ہوئیں کہنے لگے: "اے محمدؐ! ہمارے سامنے لکھی لکھائی کتاب لاؤ جسے آسمان سے ہمارے اوپر اتارو اور ہم اسے بطور خود پڑھیں اور ہمارے سامنے چشمے جاری کردو پھر ہم تمہارے پیچھے چلیں گے اور تمہاری صداقت کی گواہی دیں گے۔" (سیرت ابن ہشام، جلد:۲، ص:۱۷۴)

اسی رافع بن حریملہ نے یہ تقاضا بھی کی "اے محمدؐ! اگر تم اللہ کے رسول ہو، جیسے کہ تم خود کہتے ہو تو ذرا اللہ سے یہ کہو کہ وہ ہم سے بات کرے، یہاں تک کہ ہم اس کی بات خود سن لیں۔" (سیرت ابن ہشام، جلد:۲، ص:۱۷۶)

ایک اور مجلس میں فخاص، عبداللہ ابن صوریا ابن صلوبا، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، اشیع، کعب بن اسد، شمویل بن زید، وجبل بن عمرو بن سکینہ جیسے بزرگان یہود، حضور سرور عالمؐ سے گفتگو کر رہے تھے، کہنے لگے: "اے محمدؐ! کیا واقعی یہ قرآن

تمھیں کوئی جن یا کوئی انسان نہیں سکھاتا؟" رسولِ خدا نے فرمایا: "تم خوب سمجھتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور یہ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ تم اس حقیقت کو اپنے ہاں توریت میں مرقوم دیکھتے ہو" اس پر وہ کہنے لگے: "اے محمدؐ! پھر حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی رسول کو برپا کر دیتا ہے تو پھر جو کچھ بھی رسول چاہے، خدا اس کے لئے وہی کچھ کر دیتا ہے اور رسول جس بات کا بھی ارادہ کر لے، خدا کی طرف سے وہی کچھ کر دکھانے کا اختیار پالیتا ہے۔ سو تم آسمان سے ہمارے اوپر لکھی لکھائی کتاب اترواؤ جسے ہم پڑھیں اور پہچانیں۔" (سیرت ابن ہشام، جلد:۲، ص:۲۱۹۔۲۲۰)

یہود نے بڑی کارگر ڈھال تلاش کر لی، اب کوئی سوال نہ رہا۔ اس کا کہ داعیِ حق کی دعوت کیا ہے؟ وہ کیا بات کہتا ہے؟ اس کے لئے دلائل کیا رکھتا ہے؟ اس کی دعوت کے اثر سے کیسی زندگی بنتی ہے؟ اس کی تعلیم و تربیت سے کس نوعیت کی سیرت

پرواز چڑھتی ہے؟ اس کے تعمیری کام سے کیا نظام تمدن بنتا ہے؟ یہ سارے سوالات پیچھے چلے گئے اور سامنے یہ مطالبہ آ گیا کہ "آسمان سے کتاب اتار کر دکھاؤ"۔ اب لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہاتھ آ گیا جس نے بات چھیڑی اس سے کہہ دیا کہ ہم تو ماننے کو تیار بیٹھے ہیں، لیکن ان سے جا کر کہو کہ وہ نبی برحق ہو تو اللہ میاں سے کہہ کر ذرا ایسا ایک نشانی دکھا دیں۔ اللہ والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں، اوپر سے منوا لیتے ہیں، پھر وہ کیا رسول ہے جس کی بات عالم بالا میں درخور اعتنا نہیں ہے، لوگو! چھوڑو ان افتنار انگیز باتوں کو، جاؤ کسی اللہ والے کا دامن تھام لو، یہ تو بس یونہی ڈھکوسلہ ہے۔

یہود کا شائیلاکی طرز عمل

یہ تو معلوم عام حقیقت ہے کہ مدینہ کے محدود ذرائع و وسائل پر جب مہاجرین کی روز افزوں آبادی کا بار پڑنے لگا،

اور بے سرمایہ دبے سہارا لوگ اپنی معاشی زندگی کی تعمیر نو میں لگے تو تحریک کے بیشتر کارکنوں پر عالم فقر و فاقہ چھا گیا۔ اس امتحان فقر و فاقہ میں خود تحریک کا لیڈر اور اس کے گھر کے لوگ سب عام ساتھیوں کے برابر کے شریک تھے، بلکہ اس آزمائش میں سب سے زیادہ حصہ اسی محسن انسانیت کو ملا۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ فقر و فاقہ کی صبر آزمائیوں کو مہاجرین کی بیماری نے دوگنا کر دیا۔ نئی آب و ہوا باہر سے آنے والوں کو راس نہ آئی اور یکے بعد دیگرے نظام حق و صداقت کے سپاہی بیمار ہونے لگے۔ بخار کی ایک وبا پھیل گئی اور یہ بخار بڑا ہٹیلا اور موذی ثابت ہوا۔ ناقص غذا کے ساتھ اس نئی بلا نے جس کو نشانہ بنایا، اس کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کے چھوڑا۔ لوگ معاشی تگ و دو کے قابل نہ رہے۔ ایک طرف تحریک کا سفینہ مشکلات اور مخالفتوں کے نت نئے گردابوں سے دوچار تھا۔ نوخیز اسلامی ریاست ہر پہلو سے محتاج تعمیر تھی۔ اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے طرح طرح کے

خطرات تھے۔ دوسری طرف افرادی کار صاحب فراش ہو رہے تھے اور پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑے کا پورا پورا انتظام نہ تھا۔ اس مرحلے کو چھوٹی سی انقلابی پارٹی نے جس طرح طے کیا اور جس عمل ہو تے ہوئے پار کیا، وہ ایمان باللہ، مقصد کی محبت اور باہمی جذبہ اخوت کی طاقت تھی۔ دراصل بڑے بڑے تاریخی کارنامے انجام دینے والے افراد اور تنظیموں کی مرکزی طاقت ہوتی ہی ہے، ایمان اور اخوت! اسی طاقت نے تحریکوں کو قوی بنائے رکھا اور اسی طاقت نے ذرائع و وسائل کی کمی کے اثرات کو کم سے کمتر کر دیا۔ تاہم ناسازگار حالات کے خلاف جو کچھ جدوجہد ہو رہی تھی۔ اسے وبائے عام نے بہت کمزور کر دیا اور اسی دوران میں یہ چرچا بھی ہونے لگا کہ مدینہ کے یہودیوں نے جادو کر دیا ہے اور اب مسلمان پنپ نہیں سکیں گے۔ حالات کیسے سنگین تھے۔ آیئے اس کا اندازہ کرنے کے لئے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند رفقاء کے کارنامے ملیے۔

یہ دیکھئے سیدنا حضرت ابوبکرؓ ہیں۔ بستر مرض پہ مارے کرب سے تڑپ رہے ہیں اور ایک شعر میں اپنے دلی اضطراب کا اظہار کررہے ہیں:

کل امری مصبح فی اھلہ   والموت ادنی من شراک نعلہ

حالت یہ ہے کہ اپنے لئے موت کو جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب پارہے ہیں۔

اور ادھر ملاحظہ فرمایئے۔ یہ سیدنا بلالؓ ہیں، کروٹیں لے رہے ہیں اور درد بھری لے میں الاپ رہے ہیں:

الالیت شعری ھل ابیتن لیلۃ   بسوادو حولی اذخر و جلیل

وھل اردن یوما میاہ مجنۃ   وھل یبدون لی شامۃ وطفیل

یہ مکہ کی وادیوں اور چشموں اور پہاڑیوں کی یاد تازہ کی جارہی ہے۔ اس وادی میں ایک رات گذار لینے کی حسرت کا اظہار ہے جس میں اذخر اور جلیل نام کی گھاسیں اگتی ہیں اور وہاں

مجنہ کے چشمے کا پانی پینے اور شامہ اور طفیل نامی پہاڑیوں کا منظر دیکھنے کے ارمان ابلے چلے آرہے ہیں۔

آئیے اور ملاحظہ فرمائیے، یہ عامر ہیں۔ لبوں پہ کیا عجیب کن شعر رقصاں ہے:

انی وجدالموت قبل ذوقہ ان الجبان حتفہ من فوقہ

ان کے اختلائے بدن کا عالم یہ ہے کہ موت کے آنے سے پہلے موت کی آہٹ سن رہے ہیں۔

اور یہ ہیں حضرات شداد۔ رسول اللہؐ اپنے اس رفیق کی عیادت کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ مریض بے قرار ہو کر کہتا ہے کہ اگر بطحا کا پانی پی لیتا تو اچھا ہو جاتا۔ رسولؐ فرماتے ہیں، چلے جاؤ کون روکتا ہے۔ مریض کہتا ہے ''ہجرت!'' رسولؐ تسلی کے لئے فرماتے ہیں کہ چلے جاؤ تم جہاں بھی ہو گے، مہاجر ہی رہو گے۔''

صلح حدیبیہ پر جب مسلمان مکہ گئے تو ان کے بدن بار بار کی علالتوں نے ایسے چور چور کر دیئے ہوئے تھے کہ اہل مکہ کی طرف سے طعنے دیئے گئے کہ اور جاؤ نا مدینہ! انہی طعنوں کا ردعمل تھا کہ رسول اللہؐ کے ارشاد کے تحت مسلمان اکڑ اکڑ کر چلتے تھے۔

انہی حالات کی بناء پر حضورؐ فرماتے تھے کہ "ان شان الھجرۃ شدید" یعنی ہجرت کا معاملہ بڑا سنگین ہے، کوئی کھیل نہیں! اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک بدو نے آکر سرور عالمؐ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن مدینہ آتے ہی بخار نے آلیا۔ اس نے اس کو اسلام کی بدشگونی قرار دیا۔ اصرار کر کے بیعت ختم کرالی اور چلا گیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "مدینہ سنار کی بھٹی کی مانند ہے کہ کھوٹ میل کو الگ دیتی زر خالص کو الگ کر لیتی ہے۔ (بخاری) یعنی تحریکوں کے کار عظیم کے لئے جو لوگ اٹھتے ہیں ان کو قدم قدم پر ایسے ایسے مراحل ابتلا

پیش آتے ہیں کہ جن کو پاروی کرتا ہے جس کے پاس ایمان کا زرِکامل عیار موجود ہو، کھوٹا مال کسی نہ کسی مرحلے میں الگ ہو جاتا ہے۔ سو مدینہ کا یہ مرحلہ ابتلاء سنار کی بھٹی کا سا کام کر رہا تھا۔ (اسوۂ صحابہ از مولانا عبدالسلام ندوی، ص: ۴۳۔۴۴)

یہی دور تھا جبکہ حضور سرورِ عالمؐ نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ اے اللہ! ہمارے لئے مدینہ کو ویسا ہی دلکش بنا دے جیسا مکہ کو بنایا تھا یا اس سے بھی زیادہ اور ہمارے لئے اس کے پیمانوں (یعنی غلے اور پیداوار) میں برکت عطا فرما اور اس پر آئی ہوئی وبا کو جحفہ (میقات اہلِ شام) کی جانب منتقل کر دے۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲، ص: ۲۱۱)

دوسری طرف عالمِ فقر و فاقہ کی کیفیت حد درجہ تشویشناک تھی، نئی جگہ آ کر معاشی زندگی کی نیو ڈالنا اور پھر اس میں کسبِ حلال کا اہتمام کرنا اور وہ بھی اس عالم میں جبکہ ایک تجر

یک لحہ لحہ انفاق مال کے مطالبات لئے سامنے کھڑی ہو، ایسے حالات میں جو ابتلا پیش آ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ علمبرداران حق پر جو کچھ گذری اس کی دردناک روداد سے تاریخ، سیرت اور احادیث کے ذخائر بھرے پڑے ہیں۔

حضرت ابو طلحہؓ اس دور ابتلاء کا حال یوں بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ بھوک کی مصیبت میں گھل گھل کر جب تنگ آ گئے تو سہارا حاصل کرنے کے لئے سرور عالمؐ کی خدمت میں پہنچے، حال بیان کیا اور پیٹ کھول کر دکھائے کہ کئی روز کے فاقے کی وجہ سے (معدے میں ہونے والی ایک خاص جلن کو روکنے کے لئے) پتھر باندھ رکھے تھے۔ اس پر تاریخ کی اس عظیم ترین شخصیت نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ ایک نہیں دو دو پتھر بندھے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر اپنا دکھڑا بیان کرنے والوں کی تسلی ہو گئی۔ (شمائل ترمذی، باب ما جاء فی عیش النبی)

ایک مرتبہ اسی حال میں حضرت ابوبکرؓ بے وقت آئے

اور چاہا کہ تسلی حاصل کرنے کے لئے اپنی تکلیف بیان کریں، مگر

پھر خیال ہوا کہ اس سے قائد اسلام کو خواہ مخواہ مزید پریشانی ہوگی

تھوڑی دیر میں حضرت عمرؓ بھی آپہنچے، وہ بھی اسی امتحان کا شکار

تھے۔ باعث آمد پوچھا گیا تو انہوں نے صاف عرض کیا

کہ بھوک کے مارے بیتاب ہوں۔ حضورؐ نے یہ سنا تو فرمایا کہ

میرا بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔ طے پایا کہ اپنے رفیق مقصد

ابو الہیثم کے ہاں چلیں۔ ابو الہیثم باغات کے مالک اور خوش

حال تھے۔ تینوں اپنے رفیق کے ہاں پہنچے تو وہ بیچارے خادم نہ

ہونے کے سبب خود ہی پانی لینے گئے ہوئے تھے۔ آئے تو فرط

مسرت سے لپٹ گئے پھر باغ میں لے جا کر دسترخوان بچھایا

اور کھجوریں توڑ کر حاضر کیں۔ کھجوریں کھا کر ان فاقہ کشان راہ

حق نے ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کرتے اور ابو الہیثم کے

لئے دعائے خیر کرتے ہوئے واپس ہوئے۔ (شمائل ترمذی،

باب ما جاء فی عیش النبیؐ)

سعد بن ابی وقاص نے ایک موقع پر بیان کیا کہ تحریک محمدیؐ کا میں ہی وہ رکن ہوں جس کے ہاتھ سے ایک دشمن حق کا پہلا خون گرا، میں ہی ہوں جس نے جہاد میں اولین تیر پھینکا۔ ہم لوگوں نے ایسی حالت میں جہاد کیا ہے کہ ہم درختوں کے پتے اور کیکر کی پھلیاں کھایا کرتے تھے اور اس وجہ سے منھ کے کنارے زخمی ہو جاتے تھے اور اجابت اونٹوں اور بکریوں کی مینگنیوں کی شکل اختیار کر جاتی تھی۔ (ایضاً، یہ واقعہ ذرا بعد کے دور سے متعلق ہے لیکن اس سے مدینہ میں پیش آمدہ معاشی ابتلاء کا عمومی اندازہ ہو جاتا ہے۔)

حضورؐ کے رفیق خاص حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب میں منبر نبویؐ اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان بھوک اور فاقہ کی شدت کے مارے بیہوش پڑا ہوا تھا اور لوگ مجھ کو جنون زدہ سمجھ کر (بطور علاج) پاؤں سے میری گردن دباتے تھے حالانکہ مجھے جنون نہیں ہوتا تھا۔ وہ محض

بھوک کا عالم ہوتا تھا۔ (شمائل ترمذی، باب ما جاء فی عیش رسول اللہ صلعم) حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان کردہ ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آپ حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور کسی آیت کا مفہوم زیر بحث تھا، باتیں کرتے کرتے اور ساتھ چلتے چلتے حضرت ابو ہریرہؓ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ فاقہ کشی نے نوبت یہاں تک پہنچا دی تھی۔

اس عالم میں حضورؐ اگرچہ بیت المال میں آنے والی دولت کو ساتھ کے ساتھ رفقاء کو سنبھالنے کے لئے صرف کرتے جاتے تھے مگر وہ صرف اتنا وسیع تھا کہ بیت المال کی آمدنیاں اور انصار اور خوشحال مہاجرین کے فراخدلانہ انفرادی صدقات بدرجہ اولیٰ بھی کافی نہ ہوتے تھے۔ عام فاقہ زدہ مہاجرین کے ساتھ ساتھ اصحاب صفہ کا مستقل دارالاقامہ ضرورت مند تھا۔ مہمان آتے تھے، بدوی لوگ وقتاً فوقتاً اسلام لانے، زیارت کرنے اور احکام معلوم کرنے آتے۔ سائل آآ کر سوال کرتے

اور مسلسل نئے مہاجرین کی آمد رہتی ۔ ان حالات میں بیت المال بیچارہ بھی کیا کرسکتا تھا ۔ جب رفقاء اور اہل حاجت کی ضرورت کا دباؤ شدید ہوتا تو قائد تحریکؐ یا تو اعانت کے لئے اپیل کر دیتے اور لوگ جذبہ صادق سے اپنا مال نچوڑ دیتے یا پھر قرض لینا پڑتا ۔ قرض اپنی جماعت کے اندر سے کچھ زیادہ مل نہ سکتا تھا لہٰذا یہودی مالداروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا ۔ یہودیوں کا حال یہ تھا کہ یہ لوگ پکے مہاجن اور سود خوار تھے اور ان کے سودی جال تمام علاقے میں پھیلے ہوئے تھے لیکن محمدؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو جو جس غرض سے قرض دیتے تھے وہ سود سے زیادہ بڑی چیز تھی ۔ وہ یہ تھی کہ روپے اور احسان داری کے زور سے ان پر قابو پایا جائے اور اس ذہنیت کے ساتھ وہ قرض خواہی میں بالکل شائیلاک کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے اور توہین و تذلیل پر اتر آتے ۔ یہی حال مشرکین کا تھا ۔ اس تلخ تجربے سے خود سرورِ عالم کو بھی گزرنا پڑا اور آپؐ کے ساتھیوں کو بھی ۔

بہت سے واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

آہ! دنیا کی بھلائی کے لئے زندگیوں کی بازی لگا دینے والوں نے یہ سب کچھ بھی بھگتا، مگر اس مغلوک الحالی پر بھی اپنے ایمان اور مقصد کے بارے میں تحریک کے سپاہیوں میں کوئی تزلزل نہیں آیا۔

محسن انسانیت نے اپنے قریبی رفیق اور ذاتی نائب حضرت بلالؓ کو حکم دے رکھا تھا کہ تحریک اور اس کے سپاہیوں کی ضروریات پر وہ آمدنیوں کو بے دریغ صرف کریں۔ حضرت بلالؓ اسی طریق کار پر اکر بند رہتے تھے۔ ایک مرتبہ نوے ہزار درہم کی رقم آئی اور ایک بوریے پر ڈھیر لگا دی گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سرور عالمؐ نے اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کرا دیا اور ایک حبہ باقی نہ رہا۔ تقسیم ہو چکنے کے بعد ایک سائل آ گیا تو اس کے لئے قرض لینے کا حکم دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ کسی موقع پر سیدنا بلالؓ کے سامنے کھجوروں کا ایک ڈھیر لگا پڑا تھا۔

حضورؐ نے دریافت کیا یہ کیسا مال ہے؟ سیدنا بلالؓ نے عرض کیا

کہ اسے مستقبل کی نادیدہ ضرورتوں کے لئے روک رکھنے کا

ارادہ ہے۔ فرمایا: "کیا تم مطمئن ہو گئے ہو کہ کل قیامت کے دن

کہیں اس مال کو یوں روکے رکھنے کے بدلے جہنم کا دھواں تم

تک پہنچے۔ خرچ کرو اے بلال! اور تخت اقتدار کے مالک کی

طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کرو۔" حضرت بلالؓ ہی کا بیان ہے کہ

مدینہ کا ایک مشرک ان کے پاس آیا اور خود پیش کش کی کہ میرے

پاس وافر مال موجود ہے، جب ضرورت ہو مجھ سے لے لیا کریں

۔ چنانچہ حضرت بلالؓ نے قرض لینا شروع کردیا۔ یکا یک ایک

دن ایسا ہوا کہ حضرت بلالؓ وضو کرکے اذان کہنے کی تیاری میں

تھے کہ وہ مہاجن اپنے ساتھ کچھ اور کاروباریوں کو لئے ہوئے آیا

اور چلایا کہ "او حبشی!" حضرت بلالؓ اس کے پاس گئے۔ وہ

بہت گرم ہوا اور برا بھلا کہنے لگا اور انتباہ کیا کہ مہینہ ختم ہونے کو

ہے اگر قرضہ وقت پر ادا نہ کیا تو (عرب کے جاہلی طریق کے

مطابق) تم کو غلام بنالوں گا اور تمہارا وہی حال ہوگا جو پہلے تھا۔حضرت بلالؓ بیان کرتے ہیں کہ اس نفیحتے سے مجھ پر وہی گذری جو ایسے عالم میں ہر شریف آدمی پر گذرتی ہے۔ سیدنا بلالؓ عشاء کی نماز کے بعد اپنا دکھڑا سنانے محسن انسانیتؐ کی خدمت میں پہنچے اور ادائیگی کی کوئی تدبیر نہ پا کر روپوش ہوجانے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ جب قرض ادا کرنے کا کچھ انتظام ہوجائے گا تو میں واپس آجاؤں گا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ حضرت بلالؓ اپنے ارادے کو عمل میں لاتے، اگلی ہی صبح محسن انسانیتؐ کی طرف سے بلاوا آیا۔ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حاکم فدک کی طرف سے سامان سے لدی ہوئی چار اونٹنیاں ہدیتہً کھڑی ہیں۔ قرض خواہ کو بلا کر حساب بے باق کردیا گیا اور بقیہ مال حسب معمول مستحقین میں تقسیم کردیا گیا۔

اسلامی تحریک کے ایک سپاہی ابو حدرد اسلمی ایک یہودی کے مقروض ہوگئے لیکن ادائیگی کے لئے وہ بجز تن کے

کپڑوں کے اور کوئی چیز نہ رکھتے تھے۔ ابو حدرد نے یہودی سے
مزید مہلت طلب کی۔ لیکن اس کی شائیلا کی ذرا بھی مہلت
دینے پر تیار نہ تھی۔ وہ ابو حدرد کو پکڑ کر آنحضورؐ کے سامنے لے
آیا اور اپنا مطالبہ پیش کیا۔ حضورؐ نے ابو حدرد کو ادائیگی کے لئے
کہا۔ انہوں نے اپنے حالات سامنے رکھ کر عذر کیا۔ لیکن
یہودی قرض خواہ کی غیر انسانی ذہنیت کے پیش نظر آپ نے
اصرار کیا کہ جیسے بن پڑے ادائیگی کرو۔ انہوں نے پھر گذارش
کی کہ غزوہ خیبر سامنے ہے۔ شاید وہاں سے لوٹ کر آنے پر کوئی
صورت نکل آئے۔ حضورؐ نے پھر بشدت اس بلا سے نجات
پانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ یہودی ابو حدرد کا تہ بند لے کر ٹلا اور
اس مرد حق کو اپنا عمامہ اتار کر کمر سے لپیٹنا پڑا۔ ذرا قرضہ کی رقم
کی مقدار کا اندازہ کیجئے اور اس پر یہودی قرض خواہ کا اصرار
دیکھئے اور پھر اس ظالمانہ وصولی کا تصور کیجئے کہ اپنے مقروض
کے تن کا کپڑا اتروا کے دم لیا۔ (سیرت النبی شبلی،
جلد:۲،ص:۲۲۲)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ اسلامی تحریک کی ایک اور بزرگ ترین ہستی ہیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے تھے اور خاصے خوشحال تھے پھر بھی حالات وضروریات کے تحت ایک یہودی مہاجن سے وقتاً فوقتاً قرض لینے پر مجبور ہو جاتے۔ ایک سال اتفاق سے کھجوروں پر پوری طرح پھل نہ آیا اور قرضہ مقررہ وقت پر ادا نہ ہو سکا۔ یہودی مہاجن سے بمشکل اگلی فصل تک کے لئے مہلت مانگی۔ اگلی مرتبہ پھر فصل خراب ہوئی۔ مزید مہلت دینے سے مہاجن نے انکار کر دیا۔ آخر جابرؓ بھی اپنی رام کہانی سنانے اپنے آقا کی خدمت میں پہنچے۔ حضورؐ چند رفقاء کو ساتھ لے کر یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور اس سے اپیل کی کہ وہ جابرؓ کو مہلت دے دے۔ اس نے انکار کیا۔ حضورؐ تھوڑی دیر کے لئے ادھر ادھر گھومے اور ایک بار پھر آ کر اس سے گفتگو کی لیکن پتھر کو کسی طرح جونک نہ لگ سکی۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے آپؐ سو گئے۔ جاگے تو پھر جا کر وہی ذکر چھیڑا مگر وہ ظالم

نہ پسیجا۔ آخرکار آپؐ جابرؓ کی کھجوروں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہوئے اور ان سے فرمایا کہ کھجوریں توڑو۔ کھجوریں توڑی گئیں تو توقع سے بہت زیادہ نکلیں۔ قرضہ بھی ادا ہو گیا اور خاصی مقدار بھی بچ رہی۔ (سیرت النبی شبلی، جلد:۲، ص ۲۲۷)

حضورؐ کی ایک ذاتی زرہ ایک یہودی قرض خواہ کے پاس رہن تھی۔ آخر دم تک آپؐ کے پاس اس کو فک کرانے کے لئے اندوختہ نہ ہو سکا۔ (شمائل ترمذی باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ایک مرتبہ سرور عالمؐ سے ایک بدوی قرض خواہ مطالبہ کرنے آیا۔ اپنے بدویانہ مزاج کے مطابق اس نے نہایت تندی سے گفتگو کی۔ رفقائے نبوت نے اسے احساس دلایا کہ تم دیکھتے نہیں کہ کس ہستی سے ہم کلام ہو۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو اپنا حق طلب کر رہا ہوں۔ حضورؐ اپنے رفقا کو فرماتے ہیں کہ اس کی

حمایت کرنی چاہئے کیونکہ یہ اس کا حق ہے پھر اس کا حساب بیباق کرنے کا حکم دیا اور اس کے حق سے کچھ زیادہ دلوادیا۔ (سیرت النبی ؐشبلی، جلد: ۲، ص: ۲۳)

زید بن سعنہ کا دلچسپ واقعہ ان حالات پہ مزید روشنی ڈالتا ہے۔ یہ یہودی عالم تھے اور دیانت داری سے محسن انسانیت ؐ کے دعوئی نبوت کا جائزہ مختلف علامات کی روشنی میں لے رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک بدو آیا اور حضور ؐ سے آکر ملا۔ اس نے بیان کیا کہ میری قوم مسلمان ہوچکی ہے اور میں نے ان کو دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم اگر اسلام لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بھرپور رزق دے گا لیکن بدقسمتی سے الٹا قحط پڑ گیا ہے۔ اب اگر ان کو سہارا نہ پہنچایا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہوجائیں گے۔ حضور ؐ نے حضرت علیؓ کی طرف مستفسرانہ نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ فی الوقت کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ زید بن سعنہ نے پیش کش کی کہ مجھ سے ۸۰ مثقال

سونا لے لیں اور اس کے عوض میں وقت معین پر کھجوریں دے

دیں۔ معاملہ طے ہو گیا اور حضورؐ نے سونا لے کر بدوی کے

حوالے کر دیا۔ زید بن سعنہ کا بیان ہے کہ مقررہ میعاد میں جب

دو تین دن باقی رہ گئے تو وہ حضورؐ سے ایسے عالم میں دوچار ہوئے

کہ آپ اپنے چند رفقاء سمیت کسی کے جنازے کی نماز سے

فارغ ہو کر ایک دیوار کے پاس تشریف فرما تھے۔ زید نے

حضورؐ کے کرتے اور چادر کے پلوؤں کو کھینچتے ہوئے نہایت ترش

روئی سے کہا: "اے محمدؐ! میرا قرض ادا نہیں کرتے، خدا کی قسم میں

تم سب اولادِ عبدالمطلب کو خوب جانتا ہوں کہ پکے نادہندہ ہو۔"

حضرت عمرؓ نے زید کو گرم نگاہوں سے گھورا اور کہا کہ "او خدا کے

دشمن! کیا بکتا ہے! خدا کی قسم مجھے (حضورؐ سے) اندیشہ نہ ہوتا تو

تیری گردن اڑا دیتا۔" محسنِ انسانیتؐ نے حضرت عمرؓ کو سمجھایا کہ

ایسے موقع پر آپ کو یہ چاہیے کہ ایک طرف مجھے حسن و خوبی سے

ادائے حق کی تلقین کرتے۔ دوسری طرف اس شخص کو مطالبہ

کرنے کے بہتر طریقہ کی نصیحت کرتے۔ پھر فرمایا کہ اب جاؤ اور جا کر اس کا حساب ادا کر دو اور ڈانٹنے کے بدلے میں بیس صاع (مدینہ کا ایک معروف پیمانہ) کھجوریں مزید دو۔

یہ دراصل زید بن سعنہ کی طرف سے صاحب نبوت کا آخری امتحان تھا۔ حضرت عمرؓ سے اپنا تعارف کرلیا اور ان کو گواہ بنا کر اسلام قبول کیا اور اپنا آدھا مال ملتِ اسلامیہ پر صدقہ کر دیا۔ یہ زید یہودی مہاجنوں کی صف سے بالکل الگ اپنا مقام بلند رکھتے تھے لیکن ان کے واقعہ سے بھی یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ مدینہ میں تحریک اور اس کے افراد کی مالی مشکلات کس درجہ کی تھیں اور ان کے زیر اثر آئے دن قرض اٹھانا پڑتا تھا اور قرض خواہوں کی طرف سے سختیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں

یہود اور مالدار مشرکین نے ایک طرف تو مہاجنی محاذ تحریک اسلامی کے خلاف کھول رکھا تھا۔ دوسری طرف وہ ایک

اور مہم میں بھی مصروف تھے۔ وہ یہ تھی کہ لوگوں کو "انفاق فی سبیل اللہ" سے روکا جائے تاکہ تحریک مالی کمزوری کی وجہ سے سوکھ سوکھ کر ختم ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک تو وہ ترغیب انفاق کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے کہ لو جی مسلمانوں کا خدا بھی دیوالیہ ہو کر قرض مانگنے نکل کھڑا ہوا ہے۔ کبھی کہتے کہ اسلامی تحریک کے خدا کا ہاتھ بند ہے۔ یہ باتیں یہودیوں سے چل کر منافقین کی زبانوں پر چڑھ جاتیں اور پوری فضا کو غبار آلود کر دیتیں۔ دوسری طرف وہ انفاق کرنے والوں سے مل مل کر کہتے کہ دیکھو، کیوں اپنا مال غارت کر رہے ہو، مکہ کے چند کنگالوں کو کھلا پلا کر تم کیا حاصل کرو گے۔ اپنے بال بچوں کی خدمت کرو، کاروبار چلاؤ، آخر مال کا یہ کیا احمقانہ مصرف تم نے ڈھونڈا ہے۔ اس مہم کو چلانے والے یہود اور منافقین ہی کے بارے میں قرآن نے کہا کہ "یامرون الناس بالبخل" یعنی یہ لوگوں کو کنجوسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان معلمین بخل میں کردم بن قیس (کعب بن

اشرف کا حلیف) اسامہ بن حبیب، نافع بن ابی نافع، بحری بن عمرو، حیی بن اخطب اور رفاعہ بن زید بن تابوت نامور اور سربرآوردہ حضرات تھے۔ یہ انصار کے پاس آکر بیٹھتے اور ان سے ناصحانہ انداز میں کہا کرتے "اپنے مال یوں نہ اڑاؤ، یہ یوں جائے گا تو ہمیں تمہارے مفلوک الحال ہوجانے کا اندیشہ ہے، سوئم (تحریک اسلامی پر) خرچ کرنے میں اتنی تیزی نہ دکھاؤ، تمہیں کچھ سدھ بدھ نہیں کہ حالات کیا ہوجائیں گے" (سیرت ابن ہشام، جلد:۲، ص:۱۸۸)

یہود کے پانچویں کالم کے کارندوں میں یہ سرگوشیاں ہوتی تھیں کہ "رسول اللہ کے ساتھیوں پر مال خرچ کرنے سے باز آجاؤ، تا آنکہ یہ سب چھٹ چھٹا جائیں۔" (سورہ منافقون۔ آیت:۷)

کتنی دور اندیشانہ اسکیم تھی، یعنی ایک طرف سے جذبہ

انفاق کے سرچشمے کو بند کر دیا جائے اور دوسری طرف مہاجرین کو اپنے شائیلاک کی پنجے کی گرفت تحریک اسلامی کی گردن پہ کسی جائے اسکیم کامیاب ہو جاتی تو ایمان و استدلال اور عمل و کردار کے میدان میں مقابلہ کیے بغیر سر پر منڈلاتے ہوئے انقلاب کو شکست دی جا سکتی تھی ۔ مگر معاملہ ایک خدائے دانا و بینا اور ایک حاکم قادر و توانا سے تھا ۔ اس کی گہری تدابیر نے دشمنان حق کی چالوں کو شکست دے دی ۔

اس داستان میں دیکھنے کی چیز محسن انسانیت اور تحریک حق کے پروردہ سپاہیوں کا وہ صابرانہ کردار ہے جو مخالفین کی ظالمانہ اور گھٹیا حرکات کے جواب میں نمودار ہوا ۔ انسانیت کا وہ کیسا اعلیٰ نمونہ تھا جس نے اخلاقی علو کا دامن سخت مایوس کن اور اذیت دینے والے حالات میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا ۔

یہود کا پیدا کردہ پانچواں کالم

تاریخ انسانی کے صدہا تجربات اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ اخلاص کی روح لیے اندر لئے جب کبھی کوئی دعوت خیر و فلاح فاتحانہ اقدام کرتی ہے تو اس کے مقابلے پر آنے والی ردعملی طاقتوں میں سے ایک وہ ہوتی ہے جو رو در رو ہو کر اس سے ٹکر لیتی ہے اور وقت کی تلوار بے نیام کر کے آخر دم تک مقابلہ کرتی ہے مگر ایسے فاسد عناصر جو اخلاقی پستی کی وجہ سے بزدلی اور کمینگی کی سطح پر گر چکے ہوتے ہیں، وہ نفاق کی کمین گاہ میں بیٹھ کر ریشہ دوانیاں کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ مشرکین مکہ کی ردعملی حرکت پہلی نوعیت کی تھی۔ مگر مدینہ کے یہود اور ان کے ہم نواؤں نے دوسری پوزیشن اختیار کر لی۔

تحریک اسلامی اب چونکہ ایک ریاست کی صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ ریاست سب کی آنکھوں کے سامنے نشوونما پا رہی تھی اور ہر چہار جانب سے بیدار دل اور متحرک اور عمل پسند افراد کو چن چن کر اپنے ساتھ لے رہی تھی، لہٰذا مخالف طاقت

حسد اور احساسِ کمتری کے خوفناک ردعمل کا شکار ہوتی جارہی تھی مگر دلوں ہی دلوں میں جو اُبال تھا، اس کے لئے بہاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا اور حالات پر اثر اندازی کی صورت ممکن نہ تھی۔ نظریہ اسلامی کے مقابلے میں یہود کے پاس کوئی معقول، سیدھا سادہ، عوام کو اپیل کرنے والا اور حرکت پیدا کرنے والا تعمیری نظریہ نہ تھا۔ ان کے پاس کچھ بے جان اور کھوکھلے عقیدے تھے جو الٹا تاریخ کے بہاؤ کو روکنے والے اور انسانی فطرت میں جمود پیدا کرنے والے تھے۔ ان کے پاس تحریک اسلامی کے پیدا کردہ اخلاقی کردار کے جواب میں برابر کی ٹکر کا اخلاقی کردار نہ تھا۔ بلکہ وہ کردار کے لحاظ سے انسانیت کے کم سے کم مطلوبہ معیار سے بھی گرے ہوئے تھے، اور کوئی محرک باقی نہ تھا جو ان کو اس پستی سے اٹھا سکے۔ انسانیت کی تعمیر نو کی قرآنی دعوت جو نیا انسان بنا کے لائی تھی، یہودیت کا فرسودہ نمونہ انسانیت اس کے سامنے کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا۔ پروپیگنڈہ کے میدان میں

غلط فہمیوں اور شرارتوں کا کتنا ہی گردوغبار وہ اڑاتے پھرے لیکن
استدلال کے میدان میں وہ زک پر زک اٹھا رہے تھے۔ پھر وہ
اپنے آپ کو چاہے کچھ سمجھتے رہیں، تاریخ کی طاقت مسلم تحریک
کے ساتھ تھی اور واقعاتی پیکارگاہ میں یہود پر پے درپے کاری ضربیں
پڑ رہی تھیں۔ زمانہ ان کو پیچھے چھوڑ کر اسلامی نظریہ حیات کا
جھنڈا لہراتا آگے ہی آگے بڑھا چلا جارہا تھا۔ سیاسی لحاظ سے وہ
چاہتے تھے کہ اسلامی انقلاب کی شہ رگ کاٹ ڈالیں لیکن
حلیفانہ معاہدات نے ان کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اس
واقعاتی نقشے میں گھر کر وہ اپنے آپ کو بے چارگی و بے بسی کے
مقام پر پاتے۔ بے چارگی اور بے بسی کے اس احساس نے ان
کی سیرت کی بنیادی کمزوریوں کے ساتھ مل کر بزدلی کا رنگ
اختیار کرلیا تھا۔ بے بسی اور بزدلی کے عالم میں آدمی کے اندر
کام کرنے والے حریفانہ جذبات ہمیشہ حسد اور کینہ کی راہ سے
اسے نفاق کی کمین گاہ تک لے جاتے ہیں۔ وہ مخالف پر سامنے

سے وار کرنے کے بجائے پیچھے سے شب خون مارتا ہے۔ وہ کھلم کھلا تاخت و تاراج کے بجائے نقب زنی کی اسکیمیں بناتا ہے۔ یہود نے بھی اسی بزدلانہ موقف کو سنبھال لیا۔

"منافقین" کے ذلیل عنصر کے لئے واقعاتی صورت حال نے دو اسباب پیدا کردیئے تھے۔ ایک تو وہی یہود اور ان کے ہمنواؤں کا حاسدانہ انتقامی جذبہ برسرِ عمل تھا اور اس جذبے میں چونکہ براہ راست حملہ کرنے کی طاقت نہیں تھی، اس وجہ سے نفاق کا خفیہ محاذ برسرِ عمل آ گیا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بہت سے لوگ اپنا مستقبل بنانے کے لئے اسی چور دروازے سے اندر داخل ہونے لگے۔

اس چور دروازے کا افتتاح بہرحال یہودی ذہن نے کیا۔ ان کے اچھے اچھے سردار تھے جو اسلامی جماعت کی صفوں میں اپنے حریفانہ جذبات کو اسلام کے بہروپ میں چھپائے

ہوئے داخل ہونے لگے۔ بنی قینقاع میں سے نمایاں مرتبے کے حسب ذیل بزرگ "پانچویں کالم" کے طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

(۱) سعد ابن حنیف (۲) زید ابن لصیت (۳) نعمان ابن اوفی ابن عمرو (۴) رافع بن حریملہ (۵) رفاعہ بن زید بن تابوت (۶) سلسلہ ابن برہام (۷) کنانہ ابن صوریا۔

ان میں سے زید بن لصیت وہ شخص ہے جو بنی قینقاع کے بازار میں حضرت عمرؓ سے نبرد آزما ہو گیا تھا۔ پھر یہی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے کھو جانے پر طعنہ دیا تھا کہ "یوں تو آسمانوں کی خبر دیتے پھرتے ہیں لیکن اتنا بھی پتہ نہیں کہ اونٹنی اس وقت کہاں ہے!" اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "بخدا میرا حال یہ ہے کہ میں بجز اس کے کچھ نہیں

جانتا جو کچھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے بتادے اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹنی کے بارے میں اطلاع دے دی ہے۔ سو وہ اسی وادی میں ہے اور ایک درخت کے ساتھ اس کی باگ الجھ گئی ہے۔" چنانچہ رفقاء تلاش کو گئے تو بالکل یہی صورت واقعہ آنکھوں سے دیکھی۔

ان میں سے رافع بن حریملہ کا مقام نفاق اتنا بلند تھا کہ جس دن وہ مرا تو سرور عالمؐ نے خود فرمایا کہ "آج منافقین کے سرخیلوں میں سے ایک سرخیل مر گیا ہے۔" ایسا ہی مقام رفاعہ بن زید بن تابوت کا تھا۔ چنانچہ غزوہ بنی عبد المصطلق سے واپسی پر طوفان صرصر اٹھا اور لوگ کچھ گھبرا گئے تو حضورؐ نے تسلی دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ طوفان منافقین کے ایک سرخیل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے متحرک ہوا ہے۔ لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ رفاعہ کی روح اسی طوفان کی لہروں کے ساتھ پرواز کر چکی ہے۔ (سیرت ابن ہشام، جلد: ۲، ص: ۱۷۵-۱۷۴)

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ منافقین کی صفوں میں جتنے بھی لوگ شریک ہوئے، سب کے سب پختہ سال اور خوشحال لوگ تھے۔ ان کے سامنے مفاد تھے اور ان کے مزاج بالعموم غلط جذبات کے سانچے میں ڈھل کر پتھر کی طرح سخت ہو چکے تھے۔ نوجوان طاقت تحریک اسلامی کے ساتھ تھی۔ بدوئے تحقیق صرف ایک نوجوان پانچویں کالم میں ملتا ہے، جس کا نام قیس ابن عمرو بن سہل تھا۔

یہ گروپ اتنا ہی محدود نہ تھا بلکہ درحقیقت یہ چند حضرات تو پانچویں کالم کے قائد اور سالار تھے۔ یہ اپنے حلقوں سے منافقین بھرتی بھی کرتے، اسلامی جماعت کے اندر سے کمزور افراد کو تلاش کر کر کے ان کو متاثر بھی کرتے اور ان کو استعمال میں لاتے۔ شکوک و شبہات پھیلا کر اور مسلمانوں کی مجلسوں میں سنجیدہ معاملات میں استہزاء و تضحیک کے پہلو پیدا کر کر کے فضا کو خراب کرنے کے درپے رہتے۔ مسجد میں جا کر

تمام اہم گفتگوئیں سنتے اور پھر آ کر اپنی مجالس میں رپورٹ کرتے۔ راتوں کو سازشی مجالس میں بیٹھ کر شرارت کے نئے منصوبے بناتے اور نئے نئے طریقوں سے ان کو روبعمل لاتے۔ یوں تو اپنے انداز و اطوار کی وجہ سے نفاق کا پیدا کردہ یہ بے ڈھنگا کردار نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی نگاہ میں پہچانا جاتا تھا اور ساتھ کے ساتھ ہر مرحلے پر وحی الٰہی کی روشنی ان کے خیالات، ان کی حرکات اور ان کی کارروائیوں اور سازشوں بلکہ ان کے مجرمانہ ضمیر کی خاص خاص علامات کو نمایاں کرتی رہتی تھی۔ لیکن ایک موقع پر مسجد نبویؐ میں ان اکابرین نفاق کی حرکات حد برداشت سے باہر ہو گئیں۔ مجمع عام میں یہ ٹولی کی ٹولی بالکل الگ دھڑا بنی بیٹھی تھی اور اپنی جگہ الگ کھسر پھسر کر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سرورِ عالمؐ نے ان کو مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا بعض بزرگ تو ایسے ہٹیلے تھے کہ ان کو "پا بدست دگرے دست بدست دگرے" کی شان سے نکالا گیا۔

لیکن ان سر خیلانِ نفاق کی خود اپنی مرکزی قیادت عبداللہ بن ابی کی ذاتِ گرامی میں مرتکز تھی۔ یہ شخص جو واقعہ افک میں فتنہ کی بارود کو فتیلہ دکھانے والا ہیرو تھا۔ اس کی رگ رگ میں اسلامی انقلاب کے خلاف بغض و کینہ کا آتشیں لاوا ابھرا پڑا تھا۔ اس کا علاج بغض و کینہ کی بنیاد کیا تھی۔ یہ اسید بن حضیر کی زبانی سنئے جنہوں نے غزوہ بنی عبدالمصطلق کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی ایک شر انگیزی پر تبصرہ کرتے ہوئے قائد انسانیت کی خدمت میں عرض کیا:۔

"یا رسول اللہ! اس شخص (کے دکھی جذبات) کی رعایت فرمایئے۔ مدینہ میں جب آپ کا ورود ہوا تھا تو اس موقع پر ہم اس کو بادشاہت کی مسند پر بٹھانے کی پوری تیاریاں کر چکے تھے اور اس کے لئے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپ کی آمد سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ بچارا اسی کی جلن نکال رہا ہے۔" (تفہیم القرآن: سورہ نور کا دیباچہ) (ماہنامہ "ترجمان القرآن" جلد: ۲۵، عدد: ۲)

جن لوگوں کے بنے بنائے کھیل کسی دعوت یا تحریک
کے ہاتھوں بگڑ جاتے ہیں اور جن کے مفاد کی لنکا ایسے عالم میں
ٹوٹتی ہے کہ سامنے دو چار ہی ہاتھ پر لب بام ہوتا ہے۔ وہ پھر
اپنے سینے میں بس بھرے ساری عمر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں
ایسے شکست خوردہ حریف کبھی معاف نہیں کیا کرتے۔ اسلام
کے بارے میں یہی کیفیت تھی، جس میں عبداللہ بن ابی اول روز
سے مبتلا ہو گیا تھا اور مرتے دم تک اسی میں مبتلا رہا۔ اول اول
اسلام لے آیا تا کہ اس نئی طاقت کے نظام کے اندر اپنی جگہ
بنا سکے اور پھر اس کے اندر سے قدم قدم اوپر اٹھ کر قیادت و
اقتدار کی چوٹی تک پہنچ سکے۔ لیکن اس نظام کے اندر سے تو
جدھر بھی کوئی راستہ جاتا تھا، وہ ایمان اور عمل کے بل پر طے
ہو سکتا تھا، سو عبداللہ بن ابی کے لئے نفاق کے سوا کوئی دوسرا
مقام نہ تھا۔ ابتداً یہ نفاق مخفی رہا، لیکن ایک دن اچانک اس کے
دل کا ناسور پھٹ پڑا اور گندہ متعفن مادہ بہنے لگا۔

ہوا یہ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، سعدؓ بن عبادہ

کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ حضور گدھے پر سوار

تھے ، اور اپنے پیچھے آپؐ نے اسامہ بن زید بن حارثہ کو بٹھا لیا۔

یہی اسامہ بتاتے ہیں کہ راستہ میں ایک جگہ عبداللہ بن ابی مجلس

جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے گرد قبیلے کے لوگ حلقہ زن تھے۔ سرورِ

عالم کا گذر ہوا تو اسے برا لگا اور منہ پھیر لیا۔ حضورؐ قریب پہنچے تو

سلام کیا ، پھر ذرا دیر کے لئے رکے اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھا

اور خدا کی طرف دعوت دی۔ خدا کی یاد دلائی اور اس کے غضب

سے ڈرایا۔ اسامہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی دم سادھے بیٹھا رہا

اور کوئی بات نہیں کی لیکن جب حضورؐ بات سے فارغ ہو کر چلنے

لگے تو بڑے گستاخانہ اور بازاری انداز میں منہ پھاڑ کر کہا کہ "

اے فلاں! بات کرنے کا تیرا یہ ڈھنگ ٹھیک نہیں ، اپنے گھر میں

بیٹھ اور جو کوئی تیرے پاس جائے تو بس اس کو اپنی بات سنا دیا کر

، اور جو کوئی تیرے پاس نہ جائے اسے تنگ نہ کیا کر اور اس کے

گھر میں آکر ایسی دعوت نہ سنا کہ جو اسے ناگوار ہو۔" دیکھئے ان الفاظ کو، پرکھیے اس انداز بیان کو! لفظ لفظ زہر میں بجھا ہوا ہے اور حرف حرف سے سڑاند اٹھ رہی ہے۔ کتنے دل چھید نے والے بول ہیں، کیسے اشتعال دلانے والے جذبات ہیں۔

درحقیقت یہ عبداللہ بن ابی نہیں بول رہا تھا، یہ جاہلیت کا مٹتا ہوا دور تھا جو آنے والے دور امن وعافیت کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

اور حضورؐ نے اپنے مقام کی بلندیوں سے پستی کی اس بڑبڑاہٹ کو سنا۔ اس کریم النفس ہستی کو غصہ کی بجائے اغلباً رحم ہی آیا ہوگا۔

مجلس میں عبداللہ بن رواحہ بھی موجود تھے جو مسلم جماعت کے رکن تھے۔ ان کی غیرت نے اپنا فرض ادا کیا اور انہوں نے منافق اعظم کو ٹھک کر جواب دیا: "حضورؐ کیوں نہ

آئیں، ہم آپ کو چاہتے ہیں، آپؐ ہمارے گھروں اور ہماری مجلسوں میں آئیں گے، ہم آپؐ سے محبت کرتے ہیں اور آپؐ ہی کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سربلندی عطا فرمائی اور آپؐ ہی کے ذریعے سے ہدایت عطا کی ہے۔"

اس تجربے سے گزرنے کے بعد قائد انسانیتؐ، سعد بن عبادہ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے چہرے کا ایک خاص رنگ دیکھ کر استفسار کیا۔ آپؐ نے واقعہ بیان کیا۔ سعدؓ نے بھی وہی واقعاتی پس منظر بیان کیا کہ اللہ، آپؐ کو مدینہ لے آیا، ورنہ ہم اس کے لئے تاج تیار کرا رہے تھے۔ آپؐ نے تو آ کر اس کی بادشاہت کا خواب درہم برہم کر دیا۔ مدعا یہ تھا کہ اس کا یہ ردعمل قدرتی ہے اسے کچھ اہمیت نہ دینی چاہئے۔

یہ شخص نفاق کے پورے ڈرامے کا مرکزی ہیرو بن کر تاریخ کے اسٹیج پر کام کرتا رہا۔ سب سے آگے یہ تھا۔ اس کے

پیچھے موٹے موٹے یہودی بزرگ تھے۔ ان کے پیچھے شعوری طور پر نفاق کا کھیل کھیلنے والے عوام تھے۔ ان کے پیچھے ادھ کچرے اور متزلزل مسلمان تھے اور سب سے آخر میں جاہل اور نا سمجھ بدوی تھے۔ تحریک اسلامی کے خلاف جو بھی ردعملی حرکت نمودار ہوتی تھی، اسی میں درجہ بدرجہ ان مختلف عناصر کا حصہ ہوتا تھا۔

مدینہ میں مسلم جماعت جن جن مخالفتوں اور مزاحمتوں سے دوچار ہوئی اور سرور عالم کو جن جن شرارتوں کے طوفانی ریلوں کا سامنا کرنا پڑا، ان سب میں یہود کے زیر اثر نفاق کی اس فاسد طاقت کا بڑا بھاری پارٹ شامل رہا ہے۔ کمانڈ اگرچہ سارے محاذِ مخالفت پر یہود کی رہی لیکن جتنے بھی منفی فتنے محسن انسانیت کا راستہ روکنے کے لئے اُٹھے، ان میں عملاً بہت بڑا حصہ مریضانِ نفاق کا تھا جو یہود کا آلۂ کار بن کر کام کرتے رہے ہیں۔

مفسدانہ پروپیگنڈے کا محاذ

جمود پسند فاسد عناصر جب کسی دعوت اصلاح و تعمیر سے دوچار ہوتے ہیں تو پھر ہمہ تن اس کے علمبرداروں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ خود تو کچھ کرنا نہیں ہوتا اور خدا و خلق کی طرف سے کسی طرح کی ذمہ داریاں تسلیم نہیں ہوتیں۔ اس لئے ساری ذہانتیں اور قوتیں بآسانی منفی مصرف میں لگا دی جاتی ہیں۔ یہ عناصر غول بن کر داعیان اصلاح و تعمیر کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ دوربینیں اور خوردبینیں لگ جاتی ہیں اور پیمانے اور مسطر سنبھال لئے جاتے ہیں۔ ہر آن بات بات کا تجزیہ ہوتا ہے۔ ایک ایک واقعہ کا گہرا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہر ہر معاملے کی چیر پھاڑ ہوتی ہے۔ کوئی ٹیڑھ ادھر سے نکالی جاتی ہے، کوئی کجی ادھر سے تلاش کی جاتی ہے اور پھر ڈھنڈی پیٹ پیٹ کر اعلان کیا جاتا ہے کہ لوگو! دیکھو یہ گمراہی ہے۔ یہ فساد ہے، یہ کفر ہے، یہ اسلاف دشمنی ہے۔ یہ بزرگوں کی توہین ہے۔ یہ اکابر پر تنقید

ہے۔ چنانچہ اندگی مخالفت کے نشے میں بہک کر جب کسی بھلے
آدمی اور اس کے مفید انسانیت کام کو نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا
ہے تو پھر ایک طرف ہر بھلی سے بھلی بات کے اندر سے کیڑے
نکال کر دکھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کام کے کرنے
والوں سے ذرا سا بھی سہو ہو جائے تو بات کا بتنگڑ بنا کر رائے عام
کا طوفان اٹھا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ زریں مواقع تخریبی
عناصر کے لئے وہ ہوتے ہیں۔ جب کوئی بات یا واقعہ عام
لوگوں کے غلط توہمات اور معتقدات اور مسلمہ رسمیات کے
خلاف ہو جائے ...... خواہ وہ بجائے خود کتنا ہی برحق اور اقرب
الی الصواب کیوں نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اصلاحی تعمیری اور انقلابی
تحریکوں کو عوام کے بہت سے مسلمات کے بتوں کو توڑنا ہوتا
ہے۔ اس لئے مخالفانہ پروپیگنڈے کے لئے نت نئے
موضوعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی صورت حضور سرور عالم
صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ ان کے رفقاء کو یہود کی طرف سے

درپیش تھی۔ صبح وشام ایک نہ ایک واویلا مچا رہتا اور ایک نہ ایک اشتہار بازی ہوتی رہتی۔

ہوسِ منصب کا الزام

کسی علمبردارِ حق کے دامنِ خلوص پر نفسانیت کے دھبے ڈالنے کے لئے مخالفین نے ہر دور میں ایک الزام یہ رکھا ہے کہ یہ شخص کچھ بننا چاہتا ہے۔ کوئی منصب حاصل کرنے کے درپے ہے، اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا ہے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے خلاف یہی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ لوگ اپنی حکومت جمانا چاہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے خلاف غوغا کیا گیا کہ یہ صاحب تو یہودیوں کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح وفد نجران کی آمد کے موقع پر سرورِ عالم کے خلاف یہودیوں نے ایک پروپیگنڈہ یہ بھی کیا کہ یہ ساری جان ماریاں تو بس اس غرض سے ہیں کہ جو مقام عیسیٰ علیہ السلام کا چلا آرہا ہے۔ وہ آپ کے قبضے

میں آجائے اور عیسائیوں اور دوسرے لوگوں کو آہستہ آہستہ گھیر کر
اپنی پرستش میں لگا لیا جائے۔ ورنہ فرمایئے حضورؐ نے اس طرح کا
کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ایسے منصب کی طلب کا اشارہ تک
نہیں کیا تھا لیکن مخالف طاقت نے خود ہی اپنے ذہن سے ایک
طومار گھڑ لیا اور اپنی جگہ طے کر لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تو
یہ ہے کہ عیسیٰ بن کر پوجا کرائیں دعویٰ نہیں کیا نہ سہی، دل میں
اسی کے ارادے ہیں۔ ابھی یہ ارادے سامنے نہیں آئے تو کیا
ہوا۔ آثار بتا رہے ہیں کہ کبھی نہ کبھی یہ سامنے آ کر رہیں گے۔
وفد نجران کے ارکان کے کان ان فضولیات سے بھرے گئے
ہوں گے جبھی تو اس وفد کے ایک رکن ابو رافع قرظی نے یہ سوال
حضورؐ سے کھلم کھلا دریافت کیا۔ کہ "کیا آپؐ ہم سے یہ چاہتے
ہیں کہ ہم آپؐ کی اس طرح پوجا کریں جیسے نصاریٰ عیسیٰ علیہ
السلام کی پوجا کرتے ہیں"؟ وفد کے ایک دوسرے رکن
الربیس (یا الرئیس یا الریس) نے بھی پوچھا کہ: "اے محمدؐ! کیا

آپ ہم سے یہی چاہتے ہیں اور اسی کے لئے دعوت دیتے ہیں"؟ آپ نے جواب دیا: "خدا کی پناہ، اس بات سے کہ میں خدا کے سواء کسی اور کی بندگی کروں یا اس کے سواء کسی اور کی بندگی کی دعوت دوں۔ پس مجھے خدا نے اس مقصد کے ساتھ نہیں اٹھایا اور نہ مجھے اس کا حکم دیا ہے"۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲۔ ص ۱۸۱) قرآن بھی اس موقع پر پکار اٹھا کہ کسی انسان کا یہ منصب نہیں ہے کہ خدا اسے کتاب اور حکمت اور نبوت سے سرفراز کرے تو پھر وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ"۔

مسلم مذہبی شعائر کے بے حرمتی کا الزام

قائد انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر کے چلے آنے پر مکہ میں انتقامی جذبات نے نئے کروٹ لینی شروع کردی تھی اور مدینہ پر جنگی کارروائی کے لئے سوچا جارہا تھا۔ ان

کے جاسوس مدینہ کے اطراف میں گھومتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نامہ و پیام خفیہ طور پر یہود مدینہ کے ساتھ شروع ہو چکا تھا اور ان کے فوجی دستے وقتاً فوقتاً اسلامی ریاست کے حدود اثر تک پہنچنے لگے تھے۔ اس کے جواب میں اسلامی ریاست نے بھی اپنا نظام دیدبانی قائم کر دیا۔ فوجی اور غیر فوجی پارٹیاں گشت کے لئے نکلتیں اور قریش کے جاسوسوں اور فوجی دستوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہتیں۔ مدینہ اپنی اس نقل و حرکت سے قریش کو ایک طرف یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم سوئے نہیں پڑے ہیں اور ساتھ ہی یہ اندیشہ دلانا بھی مقصود تھا کہ اگر تم نے امن کی فضا کو خراب کر دیا تو پھر تمہارے تجارتی قافلوں پر یہ شاہراہ بند ہو جائے گی۔

اسی نظام دیدبانی کے تحت رجب ۲ھ میں آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ قریش کی نقل و حرکت اور ان کے آئندہ منصوبوں کا جائزہ لینے کے لئے قائد انسانیتؐ نے روانہ فرمایا۔ اس دستہ کو

کسی جنگی کارروائی کا مجاز نہیں ٹھیرایا گیا تھا لیکن ان کی مڈ بھیڑ قریش کے ایک چھوٹے سے تجارتی قافلے سے ہوئی تو اس عالم تقابل میں باہمی ذہنی کھچاؤ ایسے نقطہ تک جا پہنچا کہ اسلامی ریاست کے دستے نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ بقیہ کو گرفتار کر کے مال و اسباب سمیت مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ چونکہ رجب کے خاتمے اور شعبان کے آغاز کے دوران میں کسی وقت ہوا تھا۔ اس لئے اشتباہ والتباس کے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف مکہ کے مشرکین نے اور دوسری طرف مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈہ کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے اس واقعہ کو قطعی طور پر شعبان سے متعلق کر کے عوام کو اشتعال دلانے میں پورے زور سے کام لیا۔ وہ کہتے پھرتے کہ "یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر اور حال یہ ہے کہ ماہ حرام تک میں خونریزی سے نہیں چوکتے"۔ (تفہیم القرآن، جلد ا۔ ص ۱۶۵) اس پروپیگنڈہ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں بہت

نقصان دہ تھا۔ یہ مختصری نوخیز طاقت جو چاروں طرف سے دشمنوں اور خطروں میں گھری تھی اور جس کے لئے کسی بھی فرد اور کسی بھی عنصر کی حمایت بڑی قیمتی تھی۔ اس کے بارے میں عرب میں اس تاثر کا پھیل جانا کہ وہ حرام مہینوں کا احترام ختم کیے دے رہی ہے۔ درانحالیکہ اس حرمت پر ہی عرب کے دینی اور معاشی نظام کا دارومدار تھا...... اس کے حمایتیوں کو اس سے کاٹ کر اس کے مخالفوں میں دھکیل دینے والا تھا۔ پھر چونکہ اس معاملہ کا تعلق عوام کے نازک مذہبی جذبات سے تھا۔ اس لئے یہ وجہ اشتعال بھی تھا۔ خصوصیت سے یہ پروپیگنڈہ مسلمانوں کی خدا پرستی اور دینداری اور اخلاقی لحاظ سے ان کے ذمہ دارانہ پن پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا تھا۔

نخلہ کا یہ ایک حادثہ ایک وجہ سے خود اسلامی ریاست کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دستے کو کسی طرح کے تصادم کا اختیار نہیں دیا تھا۔ بغیر باضابطہ

اختیار کے اس دستے نے ایک ایسا قدم اٹھا دیا جو اسلامی

ریاست کے اس پورے منصوبے کو متاثر کرنے والا تھا۔ جو

حفاظت اور دیدبانی کی غرض سے پیشِ نظر تھا اور جس کے مطابق

بڑی احتیاط سے ہر کارروائی کی جارہی تھی۔ اب چونکہ نخلہ کا

حادثہ سرے سے ایک بے ضابطہ اور غیر قانونی کارروائی تھی۔

لہٰذا آنحضورؐ نے متعلقہ افراد سے سختی سے بازپرس کی اور ان کی

تادیب کی اور گرفتار شدہ جنگی قیدیوں کو قبول کرنے اور ان کے

اموال کو بیت المال میں لینے سے انکار کر دیا۔ اسلامی ریاست

نے اپنے نظم کے تحت اس بے ضابطگی پر جو کارروائی مناسب

تھی۔ وہ تو اپنی جگہ کر دی لیکن مخالفین نے مفسدانہ پروپیگنڈے

کا جو طوفان اٹھا دیا تھا اس کا مقابلہ زیادہ مضبوط اور مدلل اور

اخلاقی اثر رکھنے والے صاف ستھرے پروپیگنڈے سے کیا۔ خود

اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس کا جواب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کی زبان سے ان الفاظ میں دلوایا کہ:

"لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ اے پیغمبر کہیے کہ اس میں لڑنا بہت برا ہے مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے! ..... اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے!" (البقرہ۔ ۲۱۷)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مخالفین کے اس طوفانی پروپیگنڈے سے جو اسلامی جماعت کے ارکان متاثر ہوئے اور پریشانی میں مبتلا ہو کر انہوں نے سوالات کیے کہ ماہ حرام میں جنگی کارروائی کرنا اسلامی نظریہ و قانون کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ جن لوگوں پر نیکی اور صلح پسندی کا ایک غیر متوازن تصور زیادہ پرتو فگن تھا اور جو ذرا سی مخالفت سے گھبرا اٹھتے تھے۔ ان کو خاص طور پر تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں روح دین اور جوہر تقویٰ کو ہاتھ سے دیئے تو نہیں جا رہے اور کہیں ہم

سیاست زدہ ذہن کے تحت اپنے اصل مقصد سے دور جا کر عام
لوگوں کو خود ہی تو دور نہیں دھکیلتے جا رہے سو اس طرح کے فراد کی
پریشانی غیر معمولی نوعیت رکھتی تھی۔ ان کا دلی اطمینان متزلزل
ہو چلا تھا۔ لہذا وہ خصوصیت سے اس معاملے میں اطمینان
حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سوالات کے پیچھے یہ ذہن خاص طور پر
متحرک تھا۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے دشمنان تحریک کو بھرپور
جواب دیا گیا۔ فرمایا گیا کہ مشرکین مکہ جو خود تو راہ خدا سے
روکنے اور اللہ سے کفر کرنے اور زائرین حرم کا راستہ روکنے اور
باشندگان حرم کو حدود حرم سے تنگ کر کر کے نکالنے کے مجرم ہیں۔
اب وہ ماہ حرام کی حرمت کے محافظ بن کر کس منہ سے میدان میں
آ رہے ہیں۔ اس میں یہود اور منافقین کے لئے یہ خطاب مضمر
تھا کہ تم جو اہل مکہ کے ان سارے مظالم اور دینی شعائر کی
حرمتوں کو توڑ دینے والی کارروائیوں میں منہ میں گھنگنیاں
ڈالے پڑے رہے ہو اور آج بھی تم کو اس بارے میں کچھ

احساس نہیں ہے۔ واقعہ نخلہ کے سلسلے میں مسلمانوں کی ایک ایسی اتفاقی کارروائی پر کا ہنگامہ شعار بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ جس کے لئے نظام ریاست کی طرف سے باقاعدہ اجازت نہیں دی گئی بلکہ چند افراد کی نادانی سے ایک اقدام ہو گیا۔ چنانچہ اس کے نتائج کو قبول کرنے سے ریاست کے سربراہ نے انکار کر دیا اور متعلقہ افراد کو تحت تادیب بھی کر دی۔

اس واقعہ کے تاریخی آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اہل حق کے دشمن کس طرح گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ کہیں سے ان کو کوئی رخنہ ملے اور وہ اس حملہ کر دیں اور کہیں کوئی سہو اور بے احتیاطی کام کرنے والوں سے سرزد ہو اور وہ فوراً اس کو دنیا بھر میں اپنی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ اچھال دیں۔

جہاں ہر ہر لمحہ ہر ہر معاملے میں اس طرح غلط فہمیوں اور بدگمانیوں اور اشتعال انگیزیوں کے طوفان اٹھائے جاتے

ہوں گے۔ وہاں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں میں گھری ہوئی ننھی سی ریاست اور اس کو وجود میں لانے والی انقلابی تحریک اور اس تحریک فلاح انسانیت کے قائدؐ پر کیا گذرتی فضائیں بھنگوں کی طرح اڑتے پھرتے ہوں گے اور زمین پر برسات کے کیڑوں کی طرح ہر طرف رینگتے دکھائی دیتے ہوں گے لیکن بھنگوں اور کیڑوں کو نقل وحرکت نے کبھی کسی اصول و کردار رکھنے والی طاقت کے فاتحانہ قدام کو روکنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔

دین کے پردے میں نفسانیت کا الزام

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اسلام کی نافذ کردہ اصلاحات میں سے ایک ایک پر یہودی مولویوں اور منفیتوں نے نامعقول قسم کے ہنگامے برپا کیے تھے۔ بہت بڑی اصلاح منھ بولے بیٹوں کے مقام اور حقوق کے سلسلے میں نافذ کی گئی۔ چنانچہ اس پر

مخالفانہ پروپیگنڈہ کا ہنگامہ بھی زور و شور کے ساتھ اٹھایا گیا۔

ایک اہم تاریخی روایت سابق مذہبی معاشرتی تصورات کے مطابق یہ چلی آرہی تھی کہ متبنّٰی (منھ بولے بیٹے) کی مطلقہ سے حقیقی بہو کی طرح کرنا ناجائز ہے۔ اس روایت کو ختم کرنے کے لئے مشیت الٰہی نے واقعات کو بڑی عجیب و غریب صورت سے نشو و نما دی اور پھر ایک انقلابی نتیجے تک پہنچایا۔ ہوا یہ کہ زیدؓ چودہ برس کی عمر میں غلام بن کر بکے تھے اور جن کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا تھا۔ وہ حضورؐ کے گھر میں متبنّٰی کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد میں زید کے باپ اور بھائی ان کو لینے آئے اور حضورؐ نے اذن بھی دیا کہ چاہو تو جا سکتے ہو لیکن زیدؓ کو آپؐ سے اب اتنی گہری محبت ہو چکی تھی کہ اس رشتے کا ٹوٹنا گوارا نہ ہوا۔ چونکہ اصلاً اشراف عرب میں سے تھے۔ اس لئے مکہ کے کچھ بزرگوں نے جناب زینبؓ (حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن) کو ان کے نکاح میں دینا

تجویز کیا۔ لیکن زینبؓ کے بھائی اس رشتہ پر راضی نہ ہوئے،
کیونکہ نکاح کے لئے جو معیار اور پیمانے اس ماحول میں رائج
تھے، ان پر یہ جوڑا پورا نہیں اترتا تھا۔ جاہلی ذہن کی نگاہ میں
حضرت زیدؓ کے دامنِ حیات پر گویا غلامی کے دھبہ کا اثر بھی باقی
تھا اور پھر ان کی بے سروسامانی بجائے خود ایک نقص تھی۔ اسلام
آیا تو اس نے اس ذہن کو بھی بدلنا ضروری سمجھا اور محسنِ انسانیتؐ
نے خاندانی امتیازات کی روکیں نکاح اور ازدواج کے راستے
سے ہٹا کر پورے اسلامی معاشرے کو ایک خاندان میں بدل
دینے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ فی الواقع یہ دیواریں قطعی طور پر
ڈھے گئیں اور "کفو" کا ایک نیا مفہوم پیدا ہو گیا۔

آپؐ نے بڑی تاکید سے لوگوں کا ذوقِ نگاہ بدلا اور ان
کو سکھایا کہ عورتوں کو نکاح میں لینے کے لئے مرتبۂ اول پر ان
کے دین اور کردار کو دیکھو۔ باقی چیزوں کا لحاظ بعد میں ہے۔
ایک موقع پر تو یہ بھی فرمایا کہ اگر دین و کردار کے بجائے کوئی

دوسرا معیار اختیار کرو گے تو معاشرت میں بڑا فساد واقع ہو جائے گا۔ اس طرح "کفو" کا نیا تصور یہ بنا کہ ازدواجی جوڑ اس لحاظ سے بننا چاہیے کہ اصل مقصد زندگی میں کون بہترین ساتھی بن سکتا ہے اور کس کے ساتھ ذہنی اور ذوقی سازگاری زیادہ سے زیادہ ممکن ہے اور بے شمار بلکہ اکثر شادیاں اسی نئے رجحان کے مطابق عملاً ہونے لگیں۔ اس ذہنی و معاشرتی تبدیلی کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ حضرت ابو طلحہؓ نے زمانہ کفر میں حضرت ام سلیمؓ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ درآنحالیکہ موصوفہ اسلام لاچکی تھیں۔ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم ٹھیرے کافر اور میں ہوں کہ اسلام لاچکی ہوں۔ اب دو متضاد زندگیاں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ ہاں اگر اسلام قبول کرلو تو میں تم سے بجز قبول اسلام کے اور کوئی مہر بھی نہ لوں گی۔ (ملاحظہ ہو اسوۂ صحابیات، از مولانا عبدالسلام ندوی، ص ۲۴۸) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشتہ خود ام سلیمؓ کو بھی مرغوب تھا لیکن اسلام نے ایسا انقلابی

رجحان پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر انکار کر دیا مگر ساتھ ہی ترغیب اسلام بھی دلا دی۔ آخر ابو طلحہؓ اسلام لے آئے۔ نکاح ہوا اور فی الواقع ان کا اسلام ہی مہر قرار پایا (موطا امام مالک) غرض کہ معاملہ ازدواج میں ذوق اور معیار کی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ پھر بھی کچھ رکاوٹیں باقی تھیں۔ انہی کے سبب حضرت زینبؓ کے بھائی مجوزہ نکاح پر تیار نہ ہوئے۔ حضور بھی چاہتے تھے کہ یہ نکاح ہو لیکن جب اس میں مجرد ایک جاہلی رجحان رکاوٹ بنا تو یہ چیز خدا اور رسول کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پائی۔ اس سلسلے میں اشارۃً سورۂ احزاب میں گرفت کی گئی۔ ملاحظہ ہو آیت ان المسلمین و المسلمت .... اجراً عظیماً۔ (آیت ۳۵) اس آیت کی اصل اسپرٹ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ اور اسلامی ذہن اور اسلامی کیرکٹر رکھنے والے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ہمسر اور ہمدوش ہیں اور ان میں قرابت و مودت ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لئے قابل قدر

ہیں۔ کجا کہ ان کے بیچ میں خاندانی امتیازات اور فضل و شرف

کے جاہلی تصورات آ کے حائل ہوں۔ مگر اشارہ بس اتنا ہی نہیں

تھا۔ اگلی آیت بڑی سخت تھی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب اللہ اور

اس کا رسولؐ کسی معاملے کو کسی شکل میں طے کردیں تو پھر کسی

ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ

پھر اس فیصلے کے مقابلے میں اپنی پسند و ناپسند اور اپنے

معیارات کو کوئی اہمیت دے۔ اس طرح سے جو لوگ خدا اور

رسول کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ بہت دور تک بھٹک گئے۔

(احزاب۔۳۶) مطلب یہ تھا کہ جب ایک مسلم اور مسلمہ کے

درمیان رشتۂ ازدواج کے قیام کے لئے دروازے کھول دیئے

گئے ہیں تو اب اپنے راستے میں پرانے جاہلی تصورات کو اہمیت

دے کر حائل کرنا خدا اور رسولؐ کی رہنمائی اور ان کے فیصلوں

کے مقابلے میں ایک طرح کی خودسری ہے اور ایسی خودسری

گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ چوٹ بڑی سخت تھی اور ٹھیک نشانے پر

گئی۔ زینبؓ کے بھائی ان آیات کو سن کر اشاروں میں بات کو پا گئے اور نکاح کے لئے تیار ہو گئے۔ گویا شرف و ذلت کے جاہلی معیار کی زنجیر ٹوٹ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کے ذریعہ متبنّٰی کے بارے میں میں غلط تصور رائج کو بھی توڑنے کا ارادہ فرمالیا۔ بعد میں یہ ہوا کہ زوجین میں سازگاری نہ ہو سکی اور اس میں وہ ذہنی تفاوت موثر ہوا جو بطور ایک واقعہ کے فریقین میں موجود تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس شکایات آنے لگیں اور معاملات سنبھلنے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر زیدؓ طلاق دینے کا ارادہ آپؐ کے سامنے ظاہر کرنے لگے۔ اس پر آپ کو بڑی تشویش ہوئی کہ ایک ایسا نکاح ٹوٹ رہا ہے جو معاشرے میں ایک نئی انقلابی مثال قائم کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ نیز اس میں خود رسول اللہ کی تحریک اور مشورے کو بڑا دخل تھا اور آپؐ ہی چونکہ زیدؓ کی طرف سے ولی تھے۔ اس لئے

آپؐ کی بڑی ذمہ داری تھی۔ آپؐ نے بار بار اس رابطے کو بچانے

اور حضرت زیدؓ کو طلاق سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن آخر کار یہ

ساری کوشش ناکامی کی سرحد تک جا پہنچی ...... اور جس طرح کی

شکایات پیدا ہوگئی ہوں گی ان کے ازالے کی ایک ہی صورت

ممکن تھی اور وہ یہ کہ آپؐ خود زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیں۔

شریعت میں پوزیشن بالکل صاف تھی اور اس معاملے میں کوئی

رکاوٹ نہ تھی لیکن سابق جاہلی تاثرات کے تحت اندیشہ تھا کہ

لوگوں کو اچنبھا ہوگا اور ساتھ ہی مخالفین پروپیگنڈے کا ایک

موضوع پالیں گے لیکن مرضی الٰہی یہی تھی کہ زمانۂ جاہلیت سے متبنیٰ

کی غلط پوزیشن چلی آرہی تھی اس کی نفی خود آپؐ ہی کے ذریعہ

پوری ہدایت وصراحت سے کردی جائے تاکہ اس رسم کی جڑ

بالکل کٹ جائے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مخفی خیال

اور تفکر کو اشارۃً بسر عام رکھ دیا۔ فرمایا۔ وتخفی فی نفسک

ما اللہ مبدیہ و تخشی الناس۔ (احزاب ۳۷) اندار

تمہیں کہا ہے۔ تم اپنے دل کے پردہ خفا میں وہ بات لئے ہوئے

جسے اللہ کھول دینے والا ہے...... اور تم لوگوں سے اندیشہ کرتے

ہو یعنی ایک بات جو خدا کی شریعت میں روا ہے اسے لوگوں کے

جاہلی تصورات کے اندیشے سے دل میں چھپائے رکھنا اللہ کو

ناپسند ہے۔ اسے سامنے آنا چاہئے۔ اور اس کو واقع ہونا چاہئے

تاکہ لایکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیآء

ھم اذا قضوا منھن وطرا (الاحزاب) ۔۳۷) مقصود اس

سے یہ تھا کہ منہ بولے بیٹوں کے بارے میں وہ غلط قید جو چلی

آرہی ہے وہ مسلمانوں سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے۔ اسی

زنجیر جاہلیت کو کاٹنے کے لئے بھرپور ضرب لگانے کی یہ شکل

اختیار کی گئی کہ حضورؐ سے حضرت زینبؓ کا رشتہ نکاح خود اللہ

تعالیٰ نے بطور خاص قائم فرما دیا۔

بس اس واقعہ کا ہونا تھا کہ مدینہ کے دشمنان حق کے

حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ لوگ پروپیگنڈہ کرنے لگے کہ دیکھا،

یہ مذہبیت و تقدس کا ڈھونگ! منہ بولے بیٹے کے مطلقہ سے شادی رچالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیب داستان کے لئے افسانے بھی گھڑ لئے گئے۔ منہ پھٹ یہود اور منافقین نے یہ چرچا کیا کہ (نعوذ باللہ) اصل میں تو بہو پر عاشق ہو گئے تھے۔ اسی لئے طلاق دلوائی اور پھر نکاح گانٹھ لیا۔ (واضح رہے کہ زمانہ حال کے متعصب مستشرقین نے تاریخ کے اوراق سے وہ سارا گندہ مواد دامن میں بھر لیا ہے جو تحریک اسلامی کے معاندین نے پیش کیا تھا۔ خود یہ واقعہ بھی ان اصحاب دانش و تحقیق کے ہاں ایک مقبول ترین موضوع بحث بنا اور اس کو خوب نمک مرچ لگا لگا کر کتابوں کے اوراق پر پھیلا دیا گیا۔ ایک گھٹیا اور بازاری قسم کا افسانہ مکمل کر کے سامنے لایا جاتا ہے۔ نقطۂ آغاز یہ ہے کہ حضورؐ کی نگاہ اتفاقاً زینبؓ پر پڑ گئی اور جذبات بے قابو ہو گئے۔ ذرا سوچو کہ وہ شخص جو بے داغ جوانی کو لئے ہوئے ہمہ وقت مصروف رکھنے والی جدوجہد میں ساری عمر منہمک رہا اور جسے

چھین کا سامان لیا، کبھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا کردار عین پختگی کے نقطے پر پہنچ کر بس یہی کچھ رہ گیا تھا کہ اس کا دل اس کی آنکھوں کی پلکوں پر دھرا ہو۔ کیا یہ الزام اس کے مجموعی کردار میں کھپ سکتا ہے۔ پھر حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی کی لڑکی تھیں۔ بچپن سے آپ کے سامنے کھیلیں اور جوان ہوئیں، ان کا وجود کوئی نیا انکشاف نہیں تھا۔ پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آپؐ نے خود بڑے اصرار سے حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کا نکاح کرایا تھا اور اس نکاح میں آپؐ زید کی طرف سے ولی تھے۔ حالات کی یہ ساری ترتیب کیا اس افسانہ کے لئے واقعی کوئی بنیاد فراہم کرتی ہے جسے مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈہ کے محاذ کا ایک بم بنانے میں بطور مسالہ استعمال کیا تھا اور اب اسی مسالے کو دوبارہ مستشرقین اسلام کے خلاف استعمال کر رہے ہیں؟ کیا یہ باتیں عقلیت (Rationalism) اور تحقیق (Research) کے دعویداروں کے اپنے معیارات پر پوری اترتی ہیں؟) نکاح بھی

ایسا ویسا نہیں آسمانوں پر منعقد ہوگیا۔ اس نکاح کے لئے زمین

ہموار کرنے کو اپنے مطلب کی وحی بھی نازل کرالی۔ اس سے

پہلے اب تک اعتقادی اور کلامی اور فقہی امور میں مخالفانہ ہرزہ

سرائیاں تھیں مگر اس واقعہ کے سلسلے میں تو صحیح معنوں میں گندہ

پروپیگنڈہ کیا گیا اور محسن انسانیت ؐ کے اخلاقی مرتبے پر حملہ بولا

گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کسی تحریک تعمیر و اصلاح کے لئے سب

سے زیادہ کاری وار اخلاقی پہلو ہی سے ہوسکتا ہے۔ کسی صاحب

دعوت کے بارے میں اگر مخالفین یہ غوغا آرائی کرنے لگیں کہ وہ

بندۂ ہوس ہے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے لئے ہر طریقے سے

کاربری کرسکتا ہے اور وہ کسی اخلاقی معیار کا احترام کرنے پر

تیار نہیں تو اس سے بڑھ کر تعمیری کام کو نقصان پہنچانے والا حملہ

اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ بڑی آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

مدینہ میں دشمنان حق نے کتنی گندگی اس واقعہ پر پھیلائی ہوگی۔

کتنی سڑاند پیدا کردی ہوگی۔ اور انسانیت کے سب سے بڑے

خیر خواہ پر کئی روز تک کیسی سخت کرب کی گھڑیاں گذری ہوں گی۔

یہود کا یہ پروپیگنڈہ بے چارے مسلمانوں کے لئے بھی بے حد پریشانیوں کا موجب ہوا ہوگا ان کو راہ چلتے چھیڑا جاتا ہوگا۔ ان پر فقرے کسے جاتے ہوں گے اور ان کو شبہات کے چکر میں ڈالا جاتا ہوگا۔ ان میں وہ مسلم بھی تھے جو اپنے کچے پن کی وجہ سے گھبرا اٹھے ہوں گے۔ ان میں منافقین بھی گھسے پڑے تھے اور وہ اپنے بن کر عجیب طرح کی دورنگی باتیں کرتے ہوں گے۔ اس حالت میں مسلمانوں کو تسکین اور تربیت کے لئے اللہ تعالٰی نے چند حقائق ان کے ذہن نشین کرائے۔ ان کو جتایا کہ نبی پر کسی ایسی بات میں کوئی مضائقہ نہیں جسے اللہ تعالٰی نے اس کے لئے طے کر دیا ہو۔ (احزاب۔ ۳۸) اس اقدام کا مقصد بھی واضح کر دیا کہ مسلمانوں کے لئے منہ بولے بیٹوں سے نکاح کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ (احزاب۔ ۳۷) یہ اعلان بھی کر دیا کہ محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی

کے باپ نہیں ہیں (احزاب ۔ ۴۰) آخر میں خود حضورؐ سے خطاب فرما کر کہا کہ کافروں اور منافقوں کی نہ مانو اور ان کی دلآزاریوں کو بالائے طاق رکھ دو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ اور اللہ ہی کارسازی کے لئے کافی ہے۔ (احزاب ۔ ۴۸) اس سنجیدہ اسلوب سے اس مکروہ اور گندے پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا۔ جو یہود کی طرف سے حد درجہ کی ذہنی پستی کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔

ایک اور گندے بہتان کا طوفان عظیم

اوپر کے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحریک اسلامی کے نظریہ و نصب العین پر جب کسی طرف سے بھرپور وار کرنے کا موقع نہیں ملتا تو اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا بہترین طریقہ شیطان کی نگاہ میں یہی رہ جاتا ہے کہ اس کے علمبردار کی شخصیت اور اس کی قیادت عظمیٰ کے دامن تقدس پر گندگی کے

چھینٹے ڈال دیئے جائیں۔ سو ایک موقع پر اقتدار طلبی کا اور

دوسرے موقع پر نفسانیت کا گھناؤنا الزام اس کے خلاف اچھال

دیا گیا۔ اب یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے اور اسلامی تحریک کے

قائد اعلیٰ کے حرم کو نشانہ بنایا جاتا ہے جو ساری امت اور ساری

انسانیت کے لئے معاشری و اخلاقی لحاظ سے مرکزی نمونہ ٹھہرایا

گیا تھا۔ اسی حرم کے گرد نئی اسلامی معاشرت کا چھتہ تیار ہو رہا تھا

اور اس چھتے کو برباد کرنے کے لئے کارگر ترین وار وہی ہو سکتا تھا

جو اس کے مرکز پر کیا جائے۔ منفی تخریبی طاقت نے یہ آخری وار

بھی کر ڈالا۔ اس مخالفانہ وار کی دردناک داستان واقعہ افک

کے عنوان سے قرآن، سیرت اور تاریخ کے دفتروں میں عبرت

اندوزی کے لئے محفوظ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس واقعہ کی حقیقت سامنے لائیں۔

یہ بات واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اتنے

گندے بہتان کا طوفان عظیم آخر اسلامی تحریک کے پیدا کردہ

صالح معاشرے اور تربیت یافتہ نظام جماعت میں اٹھ کیسے سکا؟ کن رخنوں سے یہ طوفان تنظیم کے قلعے میں داخل ہوا اور کیسے اسے کچھ دیر کے لئے ہولناک اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کا موقع ملا۔

فتنہ آرائی کے لئے سازگار فضاء

شیطان کو اسلامی نظام اجتماعیت میں تخریب اور انتشار کے ہنگامے کھڑے کرنے کے لئے بہر حال ایک خاص فضاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فضاء چاہے جماعت کے نظم و اخلاق کی کسی کوتاہی کی وجہ سے موجود ہو جائے یا حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر پائی جائے۔ بہر حال فتنہ انگیزی کی کچھ صورتیں ہیں جو پوری ہو جائیں تو شیطان کا کید کچھ گل کھلا سکتا ہے۔ نظام مشیت جس نقشے پر گامزن ہے اس میں شیطان کے لئے کام کرنے کے مواقع کسی نہ کسی حد تک ضروری باقی رہتے

ہیں۔ خواہ کسی ہی مثالی سوسائٹی موجود ہو۔ درحقیقت انسانی فطرت میں ایسی کمزوریاں موجود ہیں جن کے راستے فتنہ کا سیلاب در آتا ہے۔ نبی کی پیدا کردہ جماعت کے بارے میں بھی یہ گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ اس کے دائرے میں فتنے کی طاقت کو کام کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں ملے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تندرست سے تندرست آدمی بھی کبھی نزلے، زکام یا بخار میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ سے پاکیزہ معاشرے کو بھی حالت مرض پیش آ سکتی ہے۔ ایک زندگی سے بھرپور اچھے معاشرے سے توقع یہی کی جا سکتی ہے کہ وہ مرض کی مدافعت میں کوتاہی نہ دکھائے گا۔ اور حملہ آور جراثیم کو ہلاک کر کے باہر پھینک دے گا۔ مگر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس میں کوئی مرض کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

شیطان کے لئے ایک نظام جماعت میں سازگار ترین فضاء نجویٰ کی فضاء ہوتی ہے۔ نجویٰ سرگوشی کو کہتے ہیں۔ کسی

اجتماعی نظام میں نجویٰ کے اصطلاحی معنی یہ ہوتے ہیں کہ پوری جماعت کے سامنے کھلم کھلا اپنے خیالات، مشوروں، تنقیدوں اور اعتراضوں کو پیش کرنے کے بجائے متفرق افراد علیحدگی میں بیٹھ کر کھچڑی پکائیں۔ نجویٰ درحقیقت اجتماعی زندگی میں ایک برے راستے کی طرف پیش قدمی کا آغاز ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے، تبھی کھلے بندوں کام کرنے سے آدمی کتراتا ہے اور سامنے آنے سے پہلے چپ چھپاتے کھچڑی پکانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی چیز آخر سازش کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بدقسمتی سے حضور اکرم کی نگرانی میں چلتی ہوئی تحریک کے اندر یہود کی سرپرستی میں منافقین نے نجویٰ کی یہ فضاء پیدا کردی تھی۔ اور یہ برابر تحریک کے قائدوں اور کارکنوں کو پریشان کرتی رہی۔ قرآن اس فضاء کو بنانے والوں کو بھی درسِ اصلاح دیتا رہا اور اسلامی نظام جماعت کے کارفرماؤں کو بھی اس بارے میں برابر انتباہ دیتا رہا۔ وہ پکارا:

"کیا تم دیکھتے نہیں رہے کہ جن لوگوں کو سرگوشیاں کرنے سے باز آنے کو کہا گیا تھا وہ پھر وہی حرکت کر رہے ہیں جس سے انہیں روکا گیا تھا اور وہ آپس میں بدی اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی پر خفیہ مشورے کرتے پھرتے ہیں"۔ (مجادلہ۔۸)

"اے ایمان والو! جب کبھی تم علیحدگی میں باہم مشورے کرو تو بدی اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی کے منصوبے نہ باندھو۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ کے لئے مشورے کرو"۔ (مجادلہ۔۹)

"یہ خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں تاکہ وہ ایمان لانے والوں کو پریشان کرے حالانکہ بغیر اللہ کے اذن کے کوئی بھی چیز ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی"۔ (مجادلہ۔۱۰)

"یہ (سرگوشیاں کرنے والے) لوگ انسانوں کی نگاہ سے تو اوجھل رہ سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ حال یہ ہے کہ جب رات کی تاریکی اور تنہائی کے پردے میں وہ ایسی کوئی بات پکاتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں ہوتی تو اس گھڑی اللہ ان کے ساتھ

موجود ہوتا ہے"۔ (النساء۔۱۰۸)

"خفیہ مشورے کے لئے کوئی تین آدمی ایسے جمع نہیں ہوتے کہ ان کے ساتھ چوتھا اللہ نہ موجود ہو۔ اور نہ پانچ کہ جن کے ساتھ چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس سے کم یا اس سے زیادہ تعداد میں کہ ان کے ساتھ وہ موجود نہ ہو..... خواہ وہ کہیں بھی ہوں"۔

(مجادلہ۔۷)

"وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم (جماعت کے فیصلوں اور قیادت کے احکام کی) اطاعت کریں گے! مگر جب (اے نبیؐ) آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک ٹولی راتوں کو سر جوڑ کر آپ کی کہی ہوئی باتوں کے خلاف کھچڑی پکاتی ہے اور اللہ ان کے منصوبوں کو لکھ رہا ہوتا ہے"۔ (النساء۔۸)

ان آیات میں بات بالکل صاف کردی گئی ہے کہ اسلامی نظام جماعت اجتماعی طور پر جن طے شدہ خطوط پہ چل رہا ہو اور جو اجتماعی فیصلے اور جماعتی روایات اس کے اندر کارفرما

ہوں ان کی حمایت اور وکالت اور ان کی پابندی اور پیروی اور
ان کے نفاذ و استحکام کے لئے تو علیحدگی میں افراد باہم دگر علانیہ
بھی اور تنہائی میں بھی آزادانہ بات چیت کرسکتے ہیں۔ لیکن ان
سے اختلاف رکھنے اور ان کو شکست دینے، ان کے خلاف بددلی
پھیلانے اور اعتراضات اٹھانے اور ان کا رخ پھیر دینے کے
لئے علیحدگی میں بیٹھ کر افراد کا خفیہ مشورے اور سرگوشیاں کرنا
ایک ایسا گھناؤنا گناہ ہے جو ان افراد کی سیرت اور عاقبت کو تباہ
کردیتا ہے اور پورے نظام جماعت کو پریشانیوں اور پیچیدگیوں
سے دوچار کردیتا ہے۔ خفیہ اختلافی سرگوشیوں کا اصلی سرشتہ
شیطان ہے جس سے اسلامی نظام جماعت کو قرآن نے خبردار
کردیا۔

خفیہ سرگوشیوں کا ایک موضوع "معصیت الرسول"
بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ درحقیقت یہی مرکزی موضوع
تھا۔ مدینہ کی تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر اس امر کی تو

سر سے گنجائش نہ تھی کہ نظم تحریک اور اس کے نظریہ ونصب

العین کو پروپیگنڈے کا ہدف بنایا جا سکے اور خود خدا کی نافرمانی

اور اس کی کتاب سے بغاوت کا اقدام کیا جا سکے۔ منافقین کے

لئے زیادہ سے زیادہ میدان فتنہ انگیزی یہی تھا کہ تحریک اسلامی کی

قیادت سے الجھیں اور علمبرداروں کی شخصیت کے خلاف لاوا

پکاتے رہیں۔ ایک اخلاقی تحریک کے لئے تباہی کا سب سے

زیادہ کارگر اور سہل ترین حربہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی بہترین

شخصیت کو داغدار کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ اقتدار طلبی اور

نفسانیت کے الزامات پہلے ہی عائد کئے جا چکے تھے لیکن

درحقیقت معاملہ ایک الزام یا دوسرے الزام تک محدود نہیں تھا۔

سرگوشی بازی کی ایک مہم (Whispering Compaign)

اور "سرد مہم" برابر چلائی جاتی رہی۔

مثلاً بعد کے دور میں جبکہ زکوٰۃ کا نظام وصول وصرف

باضابطہ طور پر قائم ہو گیا۔ حضورؐ پر ایک گھٹیا الزام یہ بھی عائد کیا

گیا کہ آپ بیت المال میں آنے والے صدقات کو من مانے

طریقے سے اڑا دیتے ہیں (ومنھم من یلمزک فی

الصدقت۔ القرآن۔ سورہ توبہ) صورت واقعہ یہ تھی کہ تمام

اندوختوں اور کاروباری سرمایوں اور مواشی اور زرعی پیداواروں

میں سے جب باضابطہ خدا کے حاجت مند بندوں کا حق لیا

جانے لگا تو ڈھیروں دولت ایک مرکز پر سمٹنے لگی اور سرکار دوعالم

کے مبارک ہاتھوں سے باران رحمت کی طرح تقسیم ہونے لگی۔

دولت کی اس بہتی گنگا کو دیکھ کر زر پرستوں کے منھ میں پانی بھر

آتا اور وہ چاہتے کہ جاہلی دور کی طرح آج بھی اس گنگا سے وہی

ہاتھ رنگیں جو پہلے سے مضبوط مالی حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن

اسلامی تحریک کے قائم کردہ نظام معیشت نے دولت کے بہاؤ کا

رخ غریب طبقوں کی طرف پھیر دیا تھا اور ارباب جاہ و حشم اس

انقلاب برپا کر سکتے تھے۔ وہ فی نفسہ اسلامی نظام معیشت پر تو حملہ نہ کر سکتے تھے۔ جو ان کی جیبیں بھاری کرنے کے بجائے الٹا ان سے بزور قانون ''زکوٰۃ'' کا ''جرمانہ'' وصول کر رہا تھا۔ بس دل کا بخار نکالنے کے لئے محض انسانیت کو نشانہ بنا لیتے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ دولت اپنے حامیوں اور اپنے چہیتوں کے بل پر دوست نوازی اور کنبہ پروری ہو رہی ہے۔ متفرق گفتگوؤں میں مسالہ لگا لگا کر کہا جاتا ہوگا۔ عام لوگوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی خدا کے نام پر نچوڑی جاتی ہے لیکن اسے اپنی دھاک بٹھانے اور اپنا اقتدار مسلط کرنے کے لئے بیدردی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پبلک فنڈز کے بارے میں کسی بھی نظام میں قیادت پر الزام لگ جائے تو سنگین ہوتا ہے لیکن خاص طور پر ایک دینی و اخلاقی نظام معاشرہ میں جہاں خزانہ اللہ کا مال کہلاتا ہو اور جس کا ہر آمد و صرف اللہ کے نام سے ..... اور اس کے احکام کے تحت کیا جاتا ہو وہاں ایسے الزام سے شدید جذباتی ہیجان پیدا کیا جا سکتا ہے۔

غور فرمائیے یہ الزام نمونے کی اس شخصیت پہ چپکایا جارہا تھا جس نے صدقہ کی آمدنی کو خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے نہیں، پورے خاندان بنی ہاشم کے لئے بمنزلہ حرام کے قرار دے لیا تھا۔ یہ شان بے لوثی جس کی کوئی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کے براق دامن پہ بھی نہایت اوچھی سیرت کے لوگوں نے اٹھ کر دھبے ڈال دیئے۔

پھر یہی لوگ تھے جن کی تعریف قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ یہ اپنی باتوں سے نبی کی ذات کو دکھ دیتے ہیں (توبہ) یعنی تحریک کے اجتماعی مسائل پہ صاف دلی سے کھلی فضاء میں بات کرنے کے بجائے یہ اس کے علمبردار کی شخصیت کو نشتر لگاتے رہتے تھے۔ اس نشتر زنی کی ایک مثال قرآن نے خود بیان کردی ہے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ اسلامی نظام جماعت میں منافقین کی حرکات وسکنات ایک ایسی بے جوڑ چیزیں تھیں کہ ان کی بو اہل ایمان کی فطرت صالحہ کو ناگوار گزرتی تھی اور وہ

مضطرب ہو ہو جاتے تھے۔ اس پر مشکل یہ تھی کہ منافقین کی

پر اسرار حرکات پر قانون اور نظم کے تقاضوں کے تحت باقاعدہ

گرفت کرنا بھی مشکل اور ان پر دم سادے رہنا بھی مشکل! اہل

ایمان بے چارے جماعتی ذمہ داری کے تقاضے سے مجبور ہو کر

اہل نفاق کی غیر صحت مندانہ حرکات سے حضورؐ پاک کو آگاہ

کرتے رہتے تھے۔ ہر نفاق زدہ آدمی آہستہ آہستہ جماعت میں

پہچان لیا جاتا۔ اور اس کے بارے میں عظمان بد اور تحریک کی

شخصیت ایک خاص طرح کا ردعمل دکھائی جو انتہائی نرمی کے

اسلوب سے آہستہ آہستہ سختی کے انداز میں بدلتا گیا۔ ان حالات

میں مریضان نفاق اپنے آپ کو ذلیل پا کر چہ چا کرنے لگے کہ

"ھــــو اذن" (توبہ) یعنی نعوذ باللہ! یہ شخص تو کان کا کچا ہے۔

معمولی سے معمولی مرتبے کے آدمی، جن کی ہمارے مقابل میں

کوئی ہستی ہی نہیں، جاتے ہیں اور جس کے بارے میں جو بات

چاہیں کہہ آتے ہیں اور وہاں ہر بات پر یقین بھی فوراً کر لیا جاتا

ہے۔ میر کاروان کی اس کمزوری کی وجہ سے ہم مارے جاتے ہیں۔ اب ہم تو ٹھہرے منافق اور سازشی اور کل کے بے حیثیت لونڈے اور فاقوں مارے غلام ہو گئے مقربین خاص!۔

کچھ ایسے ہی حالات کا ردعمل ہوگا کہ ایک دفعہ منافقین نے تحریک کے علمبرداروں سے علیحدگی میں وقت لینے اور گفتگوئیں کرنے کا ایک چکر چلا دیا۔ مجلس آراستہ ہے۔ ایک منافق صاحب بیچ میں بول اٹھتے ہیں کہ مجھے ذرا علیحدگی میں خاص بات کرنی ہے۔ حضورؐ بربنائے مروت اس کا موقع ہر کسی کے لئے کھلا رکھتے تھے لیکن علیحدگی میں خاص باتیں کرنے اور وقت لینے کا یہ ڈرامائی سلسلہ کسی اور غرض سے تھا۔ اس سے منافقین کا مدعا یہ تھا کہ ایک تو جماعت پر اپنی دھاک جمائیں کہ ہم خاص الخاص لوگ ہیں صرف اوپر کے دائرے میں ذمہ دار ترین ہستی سے خاص خاص باتیں کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضورؐ کی نگاہ میں مصنوعی طریق سے تقرب و اعتبار حاصل کیا

جائے اور یہاں ہوسکے اہل اخلاق کے بارے میں بدگمانیاں

پیدا کرکے اس ذلت کا اپاؤ کیا جائے جس میں اپنے ہی کرتوتوں

کی وجہ سے یہ حضرات گھر گئے تھے لیکن حضور کی مروت نے

منافقین کو جس تضیع اوقات کا کھلا موقع دے دیا تھا۔ اسے

فرمانروائے حقیقی نے یہ حکم دے کر ختم کردیا کہ:

"اے ایمان والو! جب تم پیغمبر سے (خاص وقت لے کر)

علیحدگی میں بات کرو تو ہر گفتگوئے خاص سے قبل صدقہ پیش

کرو"۔ (مجادلہ۔۱۳)

اس حکم سے بخل کے مارے ہوئے منافقین کی کمر ٹوٹ

گئی اور بار بار خاص وقت لینے اور علیحدگی میں بات کرنے کا

سلسلہ رک گیا۔ تاہم یہ شروع ہی تصور کیا گیا تھا کہ عثمان ہو اور

تحریک کان کا کچا (خاک بدہانشان) سو اہل اخلاق کے مقابلے

میں کیوں نہ ہم بھی کان بھر کر اسے اپنی رو میں بہا لے جائیں۔

مگر ان کو اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اہل اخلاق کے لئے کان جتنے

نرم تھے اہل فتنہ کے لئے اتنے ہی ثقیل بھی تھے۔ بہر حال اندازہ
کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کے اندر رہ کر اس کے
عثمان بردار اعلیٰ کے خلاف ایسی تحقیر آمیز باتیں کرتے پھرتے
ہوں گے۔ ان میں نظم وہ محبت و وابستگی باقی کیسے رہ سکتی تھی جو
کسی جماعت کے کارکنوں کو فعال اور متحرک بناتی ہے۔ ایک
دینی و اخلاقی نظام جماعت میں تو جو عنصر اس کے نظام امر و
قیادت کے خلاف تحقیر کا طوفان اٹھاتا ہے اور سرگوشیوں کی مہم
چلاتا ہے۔ وہ درحقیقت سرے سے ان کی حرکت، اس کے
اقدام اور اس کی فعالیت کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

تحریک جب دعوت کے مرحلے سے جہاد کے مرحلے کی
طرف ایک انقلابی موڑ مڑ رہی تھی اسی وقت ایک بڑی تعداد کا
نفاق ابھر آیا تھا۔ تحریکوں کے ایسے موڑ بہت سے لوگوں کو چکر
میں ڈال دیتے ہیں ایسے موقعوں پر توازن صرف وہی کارکن
برقرار رکھ سکتے ہیں جو پہلے سے کچھ سمجھ کر چلے ہوں کہ ہم کدھر

جا رہے ہیں اور کیا کیا منازل راہ میں پڑیں گی ورنہ دنیا بھر کی تحریکوں کو جب کوئی بڑا امر پیش آتا ہے اور وہ جست لگا کر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں تو اس تغیر کا صحیح فہم نہ رکھنے والا ضرور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے...... ایسے ہی تاریخی مواقع پر بسا اوقات اچھے خاصے متحرک افراد ذہنی الجھنوں پر پڑ کر بزدلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی تحریک اسلامی کے ساتھ بھی ہوا۔ تحریک دعوت سے جہاد کے مرحلے میں داخل ہوئی تو کچھ لوگ اپنا فکری توازن کھو بیٹھے اور خاص طور پر وہ عنصر تو ہمیشہ کے لئے نفاق کا شکار ہو گیا جو ''جہاد'' کی گراں بار ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے آمادگی نہیں رکھتا تھا اور پہلے سے ذہن وفکر کو اس مرحلے کے لئے تیار کر کے نہیں لایا تھا۔

قرآن میں مذکور ہے کہ کچھ لوگ تھے جن کو جب پہلے دور میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ کفوا ایدیکم یعنی دعوت حق پہنچاتے ہوئے ظلم و زیادتی کو خوشی سے برداشت کرو اور ہاتھ نہ

اٹھا۔ بس اقامت نماز اور ایتائے زکوٰۃ جیسی سرگرمیوں میں

منہمک رہو۔ (النساء ۔ ۷۷) لیکن ان کو اس دور میں یہ حکم

ناگوار تھا۔ بعد کے مرحلے میں جب انہی لوگوں کو "جہاد" کا حکم

سنایا گیا تھا تو وہ انسانی قوتوں سے خوف زدہ ہو کر ٹھٹک سے

گئے۔ ان کا ذہنی رد عمل یہ تھا کہ ربنا لم کتبت علینا القتال؟

(اے ہمارے رب! تو نے جہاد کا حکم ہمارے سر کیوں ڈال

دیا؟) ابھی ہم اور دعوت دیتے۔ نماز و زکوٰۃ کے ذریعے اصلاح

سیرت کرتے۔ چندے اور تعمیری سرگرمیاں جاری رکھتے۔ ایک

مرحلے کے تقاضے پورے نہیں ہوئے کہ وقت سے پہلے نئی ذمہ

داریاں لا دی گئی ہیں۔

مگر بیچارے نہ خدا سے بحث کر سکتے تھے۔ نہ اس کے

حکم کے آگے کوئی بند کھڑا کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے تو صرف

رسول کی ذات تھی۔ چنانچہ اس ذات اور اس شخصیت کو انھوں نے

آخر دم تک نہ بخشا۔ ہر ہر معرکہ جہاد سے کتراتے رہے اور ہر

نازک موقع پر طرح طرح کی باتیں گھڑتے رہے۔ انھوں نے خدا کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا انتقال اس کے دین کی تحریک چلانے والے علمبردار حق سے دل کھول کر لیا۔

تحریکیں جب معرکہ آرا ہوتی ہیں تو ان کے علمبردار مخالف طاقتوں کو جہاں ضربیں لگاتے ہیں...... وہاں ان کے ہاتھوں چوٹوں پر چوٹیں کھاتے بھی ہیں۔ تدابیر کے تیر نشانہ پر لگتے بھی ہیں اور اچٹ بھی جاتے ہیں۔ نتائج امیدوں کے مطابق بھی نکلتے ہیں اور خلاف بھی نکل آتے ہیں۔ ایسا تو کوئی بھی میدان کارزار نہیں پایا گیا جس میں ہر نقصان ایک ہی فریق کے حصے میں آئے اور ہر فائدہ دوسرے فریق کے حصے میں رہے، جو فریق آخری فتح بھی حاصل کرتا ہے وہ بھی بہت سی جانیں فتح کی قیمت میں پیش کرتی ہے۔ بہت سے زخم کھاتا ہے بہت سامان جنگ کی آگ میں جھونکتا ہے۔ لیکن مدینہ کی اسلامی تحریک کے اندر کام کرنے والے منافقین ان مع العسر یسراً

کے اس فلسفۂ ربانی سے خالی الذہن ہو کر ہر تکلیف اور ہر نقصان اور ہر چوٹ پر بے اختیار چلا اٹھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے تحریک کے کارپرداز کی کوتاہی بصیرت کا (نعوذ باللہ) قرآن میں اس ٹھنڈے ٹھنڈے فلسفیانہ پروپیگنڈے کا واضح طور پر تذکرہ موجود ہے۔

"اور اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری (مراد ہے ذات رسالت مآب) بدولت ہے"۔ (النساء۔۷۸)

یعنی تحریک کے معرکوں میں جو چوٹیں لگتیں، جو نقصانات پیش آتے، جو قربانیاں دینی پڑتیں، اور جن تدابیر کے نتائج حسب مراد برآمد نہ ہوتے۔ ان سب کی ذمہ داری سرور عالم کی گردن پر ڈال دی جاتی، کہ یہ سب انہی کا کیا دھرا

ہے۔ مطلب یہ کہ دین فی نفسہ برحق ہے۔ تحریک پاکیزہ، نظام جماعت لاجواب مگر بس جن ہاتھوں میں رہنمائی ہے انہوں نے سارے کام کو عجیب چکروں میں ڈال دیا ہے۔ ذرا احمقیانہ شان ملاحظہ ہو کہ اللہ سے بات بنا رکھی ہے اور فوائد اور کامیابیوں کی نسبت بڑے اہتمام سے اس کی طرف پھیری جارہی ہے۔ گویا پروپیگنڈہ فلسفیانہ ہی نہیں بڑا احمقیانہ بھی تھا مگر یہ منافقانہ شان اتنا جو رسولؐ جیسے سربراہ کار تحریک کی خیر خواہی و اطاعت کا اتنا بھی حق ادا نہ کرسکی جتنا اسلام نے ایک حبشی غلام تک کی امارت کے لئے طلب کیا ہے اور جو خدا کے رسولؐ اور تحریک اسلامی کے بہترین عثمان بردار سے بالا بالا خدا سے رشتہ قرابت جوڑ کر رکھنا چاہتی تھی۔ اس سے بڑھ کر خود فریبی کی اور کون سی شکل ہوگی جو انسان نے اپنی تباہی کے لئے ایجاد کی ہو۔ اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "حسنات" کی جو نسبت وہ لوگ اللہ تعالی کی طرف کرتے تھے۔ وہ بجائے شکر و اعتراف

نہ تھی بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ حالات کے اندر جو اچھے پہلو ابھر آتے ہیں اور معرکہ آرائیوں سے جو مفید نتائج برآمد ہوجاتے ہیں ان میں محسن انسانیت کی قیادت اور بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پیدا کردہ اتفاقات ہیں (اس موقع پر یہ بتادینا مفید ہوگا کہ صاحب "موضح القرآن" نے اپنے حاشیہ میں بالکل یہی بات یوں ارشاد فرمائی ہے کہ "یہ منافقوں کا ذکر ہے کہ اگر تدبیر جنگ درست آئی اور فتح وغنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی یعنی اتفاقاً بن گئی۔ حضرت کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے حضرت کی تدبیر کا"۔ (ملاحظہ ہو حمائل شریف مطبوعہ تاج کمپنی قسم ۔۸)

مدینہ کی تحریک اسلامی کے قائد اعلیٰ کو کن ذہنی احوال سے گزرنا پڑتا ہوگا جبکہ ہر موقع تکلیف پر گھر کے اندر مخالفانہ تبصرہ کرنے اور ہنسی اڑانے وار تحقیر کرنے والے نام نہاد ساتھی

موجود ہوں، بات بات پہ کہتے پھرتے ہوں کہ اس غلط ناں بردار تحریک کے ہاتھوں یہ مصیبت آپڑی، اب وہ زخم لگا۔ اب ادھر سے تباہی آپڑی۔ ہر اہم اقدام کے نتائج نکل آنے کے بعد پنڈت بن کر بیٹھ جاتے ہوں اور تبصرہ کرتے ہوں کہ یوں نہ کیا جاتا ووں کیا جاتا۔

اسی گھٹیا ذہنیت کے ساتھ وہ ہر معرکہ کے سامنے آنے پر یاوہ گوئی کرنے لگ جاتے۔ مثلاً کہتے کہ ہمیں اندیشہ یہ ہے کہ حالات کا کوئی چکر ہمیں اپنی لپیٹ میں نہ لے لے"۔ (المائدہ۔۵۲) مراد یہ ہوتی تھی کہ اس تحریک کی گاڑی کو جس ڈھب سے چلایا جارہا ہے اس کے پیش نظر ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ اب کسی چٹان سے ٹکرائی اور اب کسی کھڈ میں گری!..... آخر کیوں مفت میں اپنے آپ سے ہاتھ دھوئیں۔

جنگ احد کے موقع پر یہی ذہنیت تھی جس نے حسرت

ظاہر کی تھی کہ لو کان لنا من الامر شئ ما قتلنا ھھنا"۔
(یعنی اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو
یہاں ہم نہ مارے جاتے (تفہیم القرآن سورہ آل عمران آیت،
۱۵۴) اس ذہنیت میں آنحضورؐ کی قیادت و بصیرت کے خلاف
صریح بے اعتمادی موجود تھی۔ یہ اپنی جگہ عقل کل تھے۔ اور جو شخص
کئی برس سے وحی الٰہی کی روشنی میں تحریک چلاتا آ رہا تھا وہ پیغمبر
ہونے کے باوجود ان کی نگاہ میں کچھ نہ تھا۔ اگر کہیں معاملہ کسی
پیرو نبوت کی قیادت کا ہوتا تو خدا جانے بصیرت کے ان
ٹھیکیداروں کے ہاتھوں اس کی کیا گت بنی ہوتی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تحریک کی براہ
راست مخالفت کے بجائے سرور عالمؐ کی شخصیت کو ہدف بنا کر
بالواسطہ حملے کا کامیاب ترین اسلوب اختیار کیا گیا تھا۔ تحریک
کے میر کارواں ہی کے خلاف اعتراضات، تحقیر اور بیہودہ خردہ
گیری کا لاوا انجوی کے ناپاک ماحول میں پکایا جاتا اور اس کی

نافرمانی اور اس سے سرکشی کرنے کے لئے نت نئے اقدامات زیر غور لائے جاتے۔

اخلاقی نظام جماعت کی پیچیدگیاں

یہ فضا شیطان کے لئے کام کرنے کا بہترین اور وسیع میدان اپنے اندر رکھتی تھی۔ خاص طور پر اس کے دو پہلو فتنہ پردازوں کے حق میں جاتے تھے۔ تحریک اسلامی کا جماعتی نظام اخلاقی نظام تھا۔ اخلاقی نظام کی ایک خاص پیچیدگی یہ ہے کہ اس میں صریح قابل گرفت واقعات جب تک ثابت شدہ حقائق کی شکل اختیار کر کے سامنے نہ آجائیں، ان پر نہ جماعت گرفت کر سکتی ہے اور نہ خرابی محسوس کرنے والے افراد حالات کے دھندلے پس منظر کو آخری نتائج نکلنے سے قبل برسر عام لا سکتے ہیں۔ اسلام کا اخلاقی نظام جماعت اپنے افراد کو ایک دوسرے کے بارے میں سوء ظن سے روکتا ہے اور ایک مخلص آدمی آخری حد تک

مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مشتبہ طرز عمل کے ہر جز کی
بہتر سے بہتر تاویل کرتا رہے اور پھر اگر وہ غیر صحت مندانہ
سلسلۂ احوال کی بے شمار کڑیوں کے مل جانے پر اپنے ذہن کی
گہرائی میں کوئی بری رائے قائم کر بھی لے تو بھی زیادہ سے زیادہ
وقفہ اس انتظار میں گذارے کہ شاید اس کے سوئے ظن کی تردید
کرنے والی کوئی واضح حقیقت سامنے آجائے۔

محض تاثرات۔ چاہے وہ اس کی اپنی نگاہ میں کتنے ہی
وقیع کیوں نہ ہوں۔ اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو ایک مقدمہ
کے طور پر باقاعدہ جماعت کے سامنے لا کر نظم کو متحرک کیا جائے
ان وجوہ سے مدینہ میں اہل اخلاص مجبور تھے کہ وہ فتنہ پسندوں
کی ابتدائی سرگرمیوں کو جو نجویٰ کے دھندلکے میں چل رہی
تھیں۔ چند ناخوش آئندہ آثار و علائم کے سامنے آجانے پر بھی
چپ چاپ دیکھتے رہیں۔ ہاں جب فتنہ کی فصل باقاعدہ برگ و
بار لانے لگی۔ تو پھر کہیں جا کر اخلاقی نظام جماعت ان کو موقع

دیتا کہ وہ زبان کھولیں اور اجتماعی نظم کو حرکت میں لائیں۔

دوسری پیچیدگی اخلاقی نظام جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے سربراہ کار کی شخصیت اور اس کے دوسرے اہل حل و عقد اور ارباب امر کی ذوات کو کوئی لپیٹ میں لے لے تو ان کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں جماعت کی انتظامی مشینری کی باگ ڈور ہوتی ہے اور جن کے ہاتھوں فتنوں کا سر کچلا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف فتنے انہی کو نشانہ بنا کر ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں کہ اگر وہ ارباب فتنہ کا پول ساری جماعت کے سامنے پوری طرح کھلنے سے پہلے ان کے خلاف کوئی کارروائی کریں تو ان پر الزام آتا ہے کہ تنقید اور اختلاف کو دباتے ہیں اور آوازہ حق بلند کرنے والوں کو آمرانہ طریقوں سے شکست دیتے ہیں جس طرح فرد کے معاملے میں کہا جا سکتا ہے کہ شرافت جہاں سب سے بڑی طاقت ہے وہاں شرافت ہی سب سے بڑی کمزوری

بھی ہوتی ہے بالکل اسی طرح جماعتوں کے لئے اخلاقی نظام جہاں سب سے بڑی طاقت ہے، وہاں یہی اخلاقی نظام ان کی سب سے بڑی پیچیدگی بھی ہے۔ اس پیچیدگی کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ جماعت اپنے مجموعی ذہن کے لحاظ سے اتنی بیدار اور اپنے کردار کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی چیز کو اپنے اندر نہ چلنے دے۔ اس کے دائرے میں کوئی گوش ہوش جماعتی نظم کے خلاف سرگوشیاں سننے کے لئے تیار نہ ہو اور کوئی زبان کان میں پڑی ہوئی ہر بات کو ادھر ادھر پھیلانے کی جرأت نہ کرے۔ مگر اس انتہائی معیار تک عملاً جماعت کی جماعت کا پہنچنا اور ہر آن اس پر قائم رہنا مشکل ہے۔ گھٹیا باتیں سوچنے والے دماغوں، ان کو پھیلانے والی زبانوں اور ان کو سننے والے کانوں سے کوئی انسانی معاشرہ بالکل ہی پاک نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر، نطق اور سماعت میں سے شیطان کچھ نہ کچھ حصہ لے ہی اڑتا ہے۔

منافقین نے اخلاقی نظام کی اس ڈھیل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، لیکن انجام کار کے لحاظ سے وہ اس کی زبردست طاقت کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ان کے پورے کارنامے کا خلاصہ قرآن کی زبان میں بس یہ تھا "ھموا بما لم ینالوا" وہ جس مقصود کی طرف لپکے تھے اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے مگر جماعت کو پریشان تو کیا۔ اسے اضطراب میں تو ڈالے رکھا۔

تموج کی اس سازگار فضاء میں جس میں تحریک کے علمبردار اولین کی ذات ہدف بنی چلی آرہی تھی اور یکے بعد دیگرے اس کے خلاف ناوک اندازیاں ہورہی تھیں۔ ناپاک سے ناپاک بہتان کے کسی طوفان عظیم کا اٹھا دینا ہرگز ناممکن نہ تھا۔ بشرطیکہ کوئی اچھا موقع قسمت سے فتنہ پردازوں کے ہاتھ آجائے۔ شیطان کو اس فضاء سے فائدہ اٹھانے اور منافقین کے گروہ کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کیلئے دوسری ضرورت ایک فعال کردار کی تھی جس کا ذہن شرارت اٹھانے کے لحاظ سے

موجدانہ اور تخلیقی ہو اور جسے نجوی کے پیدا کردہ بارود کے ڈھیر میں ہی جمالو کی طرح ایک چنگاری اٹھا پھینکنے کی جسارت حاصل ہو۔ سو اس طرح کا فعال کردار عبداللہ بن ابی کی صورت میں پہلے ہی موجود تھا۔ اس شخص کے اندر اپنی شخصیت اور اہمیت کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا...... آخر ہجرت سے پہلے مدینہ کی بادشاہت کا تاج اسی کے سر پر تو رکھے جانے کے لئے زیر تیاری تھا! لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس کی تمناؤں کے راستے میں روک بن گیا۔ بادشاہت تو دور رہی، اسے اپنے کردار کے سبب تحریک اسلامی کے دائرے میں آ کر مرتبہ اولین تو درکنار، مرتبہ ثانی و ثالث تک بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس حادثے نے اس کے ذہن میں بڑا تلخ اور زہریلا ردعمل پیدا کر دیا۔ یہ ردعمل ہر آن ایک نہ ایک نئے فتنے کی شکل میں مدو جزر پیدا کرتا رہتا تھا۔ شیطان انسانوں میں براہ راست تو بہت ہی تھوڑا کام کرتا ہے اسے آلہ ہائے کار کے طور پر شیاطین انس

کی ضرورت ہوتی ہے اور شیاطین انس کو فی سبیل اللہ فساد میں متحرک رکھنے کے لئے وہ ان پر کوئی سرخیل چاہتا ہے۔ کوئی امام فتنہ! یہ امام فتنہ اسے مدینہ میں بنا بنایا ہاتھ آگیا اور تھا بھی تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر! یہ ایک شخصیت ایک پیغمبر کی قیادت میں چلنے والی تحریک پر بظاہر آمنا و صدقنا بھی کہہ چکی تھی اور دوسری طرف اسی پیغمبر کی ذات اور اس کے مشن کے ساتھ ہر پہلو سے بھڑ رہی تھی۔

انانیت (Self Importance) کے زیر اثر اس فعل کردار نے بڑے تاریخی موقع پر اپنے جذبہ حسد کے بھڑکتے آتش دان میں سے چنگاری اٹھا کر حرم نبوی میں ڈال دی اور آناً فاناً سارا معاشرہ ذہنی حیثیت سے بھڑ بھڑ جلنے لگا۔

حضرت عائشہؓ کی آپ بیتی

اس طوفان عظیم میں حضرت عائشہؓ کے سفینۂ قلب و

روح پر جو کچھ گزری اس کی مستند تفصیل خود آنجناب اور دوسرے

رواۃ کی زبانی، حدیث، سیرت اور تاریخ کی اہم کتابوں میں

محفوظ ہے۔ میرے سامنے اس وقت زاد المعاد (ملاحظہ ہو: ج ۲

ص ۱۱۳۔۱۱۵) اور سیرت ابن ہشام (ملاحظہ ہو جلد ۳، ص

۳۰۲۔۳۰۷) جیسے مستند ماخذ ہیں لیکن چونکہ صاحب تفہیم القرآن

نے حضرت عائشہؓ کی روداد الم کا بہترین الفاظ میں ترجمہ کر دیا

ہے۔ لہذا اسی کو مستعار لیتا ہوں۔

"مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی

رہی شہر میں اس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی مگر مجھے کچھ پتہ نہ

تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔

آپ گھر میں آتے تو بس یہ پوچھ کر رہ جاتے کیف تیکم (کیسی

ہیں یہ؟) اس سے زائد کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا

کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپؐ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں۔ ایک روز رات کے وقت رفع حاجت کے لئے میں مدینہ کے باہر گئی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلا نہ تھے اور ہم لوگ جنگل میں جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسطح بن اثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں (دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی مگر اس احسان کے باوجود مسطح بھی ان لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہؓ کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے) راستہ میں ان کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: غارت ہو مسطح! میں نے کہا: اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو۔ اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے''؟ انہوں نے کہا۔ بیٹا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں! پھر انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ افتراء

پروا لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں (منافقین کے سوا، خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے ان میں مسطح، حسان بن ثابت مشہور شاعر اسلام، اور حمنہ بنت جحش، حضرت زینب کی بہن) کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔ یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لئے آئی تھی۔ سیدھی گھر گئی اور رات بھر رو رو کر کاٹی۔ ماہنامہ ترجمان القرآن ج ۴۵، عدد ۴، ص ۱۹ ۔ ۱۷ (اس موقع پر ابن ہشام کی لی ہوئی روایت میں یہ الفاظ بڑے اہم ہیں کہ "رونے کا یہ عالم رہا کہ" مجھے اندیشہ ہو گیا کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا"۔ (ن۔ص)

حضرت عائشہؓ اس کرب میں جان گھلا رہی تھیں۔ لیکن شہر بھر میں چہ میگوئیوں کا ایک چکر چل رہا تھا۔ ان کی طرف سے سب سے بڑھ کر صفائی دے سکنے والے ان کے والد اور شوہر ہی ہو سکتے تھے جو ان کے ذہن و کردار کا قریبی اور تفصیلی علم و تجربہ

رکھتے تھے۔ مگر اس طرح کے بہتان جب ظالم لوگ لگا دیتے ہیں تو جو جتنا قریبی ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ پیچیدگی میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی صفائی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ والد اور شوہر دونوں دم بخود تھے اور چار جانب سے زبانوں کے چھوڑے ہوئے تیر کھا رہے تھے۔

انسانیت کے محسن اعظمؐ پر یہ گھڑیاں جس درجہ شاق گذری ہوں گی..... ذاتی لحاظ سے بھی اور تحریک کے مفاد کے لحاظ سے بھی..... ان کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہر شریف اور حساس اور ذمہ دار آدمی کر سکتا ہے۔ صبر و سکون سے بہت کام لیا۔ لیکن اس نازک معاملہ کو جو موجودہ حالت میں معلق تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ادھر یا ادھر کوئی ایک فیصلہ ناگزیر تھا۔ سو حضورؐ نے غیر جانبدارانہ طریق سے تحقیق شروع کی۔ اپنے دو قریبی رفقاء حضرت علیؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کو طلب فرمایا اور ان سے رائے طلب کی۔ حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ

آپ کی زوجہ محترمہ ہیں اور ہم ان کے بارے میں بجز خیر کے کچھ نہیں پاتے، یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جسے پھیلایا جارہا ہے"۔ (سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۳۳۶) حضرت علیؓ نے بالکل دوسرے ہی پہلو سے مسئلے کو لیا اور فرمایا: "یا رسول اللہ عورتوں کی کمی نہیں۔ آپؐ اس کے بجائے دوسری بیوی کر سکتے ہیں۔ یوں آپ لونڈی کو بلا کر تحقیق فرمالیں۔ (سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۳۳۶) اصل میں حضرت علیؓ کا منشا یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ حضور پریشان ہیں کیوں نہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کرلیں۔ جس کے بارے میں ایک طوفان اٹھا دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے خاص رشتے کی وجہ سے اس معاملے کے تحریکی پہلو کی بہ نسبت حضور کی ذاتی پریشانی کو زیادہ اہمیت دی اور وہ رائے دی جس سے آپ ذہنی الجھن سے نکل کر مطمئن ہو جائیں۔

حضرت علیؓ کے مشورے کا دوسرا جز سرور عالمؐ نے قبول

فرمالیا اور اس کے مطابق گھر کی خادمہ کو طلب کیا گیا۔ حضرت
علیؓ نے چھوٹتے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا اور مار کر کہا کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ سچ کہہ دو۔ اس نے کہا۔ ''خدا
کی قسم میں بھلائی کے سوا، کچھ نہیں جانتی اور میں اس کے علاوہ
اور کوئی نقص عائشہؓ میں نہیں نکال سکتی کہ میں آٹا گوندھتی تھی اور
کہہ کر جاتی ذرا اسے دیکھتی رہنا، اور وہ پڑی سو جاتیں اور
بکری آ کر آٹا کھا جاتی'' (سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۳۴۶)
اس بیساختہ بیان میں خادمہ نے جتنی مکمل صفائی حضرت عائشہؓ
کی دے دی تھی اس پر کوئی دوسرا بیان مشکل ہی سے اضافہ کر سکتا
ہے۔ اس نے ایک ایسی بھولی بھالی اور سادہ لوح لڑکی کا حقیقی
نقشہ پیش کر دیا۔ جس نقشے میں کسی شر کو انسانی عقل نصب نہیں
کر سکتی..... اس کے ساتھ ساتھ دوسرا اقدام تحریک اسلامی کے
سربراہ کار اعلیٰ (سیرت ابن ہشام کی روایت کے بموجب واقعہ
کا یہ جزء ترتیب وقوع کے لحاظ سے مقدم تھا۔ ملاحظہ ہو ج ۳، ص

(۳۲۶) نے یہ کیا کہ مجلس عام میں خطاب فرمایا۔ حمد وثناء کے بعد بڑے دردبھرے الفاظ زبان سے نکلے:

"آخر ان لوگوں کا مدعا کیا ہے جو مجھے میرے اہل خانہ کے بارے میں دکھ دیتے ہیں اور ان کے متعلق خلاف واقعہ باتیں کہتے پھرتے ہیں، خدا کی قسم، ان کے بارے میں بجز بھلائی کے اور کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے اور وہ یہ بات ایک ایسے شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے بھی بھلائی کے سوا میرے علم میں کوئی اور بات نہیں ہے اور اس نے میرے گھر میں بھی میری موجودگی کے بغیر کبھی قدم نہیں رکھا۔ (سیرت ابن ھشام ج ۳، ص ۳۲۵)

دوسری روایت میں ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

"کوئی ہے جو مجھے اس شخص سے بچائے جو میرے گھر والوں کے بارے میں مجھے ایذا دیتا ہے"؟ (زادالمعاد ج ۲، ص ۱۱۴)

یہ سن کر قبیلۂ اوس کے سردار اسید بن حضیر نے اٹھ کر عرض کیا: "یا رسول اللہ! اگر ایسے لوگ ہمارے قبیلے کے ہوں تو ہم ان سے نمٹ لیں گے اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہوں تو آپ حکم دیں۔ خدا کی قسم! ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں"۔ دوسری طرف سے خزرجیوں کے سردار سعد بن عبادہ بھنا کر اٹھے اور کہا۔ "جھوٹ کہتے ہو بخدا ہم ان کی گردنیں نہیں ماریں گے۔ ہاں ہاں! خدا کی قسم! تم نے یہ بات اسی لئے کہی ہے کہ ان کا تعلق خزرج سے ہے۔ حضرت سعد کا یہ خلاف توقع جواب اسید بن حضیر کو سخت ناگوار گذرا۔ انہوں نے غالباً یہ محسوس کیا ہوگا کہ جس جماعت میں مجرموں اور فسادیوں اور شرپسندوں کو پناہ اور سرپرستی کسی نمایاں شخصیت کی طرف سے حاصل ہو جاتی ہے اس کے لئے اجتماعی ماحول کی تطہیر آسان نہیں رہتی۔ عبداللہ بن ابی ہمیشہ تحریکوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک مضبوط اور خوشنما نظام

جماعت کا معدہ ایسی مکھیوں کو جزو بدن نہیں بننے دیتا بلکہ اگل کر پھینک دیتا ہے۔ البتہ اگر کسی شرپسند کو کسی نظام جماعت کے اندر ممتاز اور مضبوط افراد اپنے پروں کے نیچے لینے والے مل جائیں تو پھر مار ہائے آستین پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اور جماعتوں کو ان کے ڈنک کھانے پڑتے ہیں۔ اسی تلخ حقیقت کے احساس کی بناء پر حضرت اسید شدت جذبات میں بول اٹھے: "تم غلط کہتے ہو۔ بخدا! بلکہ تم خود منافق ہو، جبھی منافقوں کی وکالت وحمایت کرتے ہو"۔ (سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۳۲۵)

یہ ناخوشگوار صورت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اوس و خزرج کے درمیان کھنچاؤ پیدا کرنے کے لئے بھی تو متواتر فتنہ کی بارود بچھائی جارہی تھی۔ جبھی ذرا سی بات پر جذباتی ہیجان پیدا ہوگیا اور جماعت کے دو گونہ عناصر متحریک ہوگئے۔ کچھ ادھر سے اٹھے کچھ ادھر سے، اور قریب تھا کہ اوس و خزرج باہم دگر گتھ

جائیں۔ دونوں قبیلوں کو شیر و شکر کرنے والے قائد جلیل کو یہ گوارا نہ تھا کہ برسوں کی محنت سے بندھا ہوا یہ شیرازہ آپکی ذات کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے اور خود تحریک ہی کی چولیں ہل جائیں۔ آپ منبر سے اتر آئے۔ لوگوں کو ٹھنڈا کیا اور مجلس برخاست کر دی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۳۲۵)

حضورؐ کے لئے جماعت کے اس کمزور پہلو کا یہ نیا تجربہ پہلی پریشانی میں کتنے اضافہ کا موجب بن گیا ہوگا۔ یہ دراصل عصبیت کی وہی بارود پھٹ رہی تھی جسے عبداللہ بن ابی غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر دلوں کی گہرائیوں میں بچھا چکا تھا۔

کہانی کا آخری حصہ بھی، جس نے حزنیہ کو طربیہ بنا دیا۔ خود اس کہانی کے مرکزی کردار (حضرت عائشہؓ) کی زبانی سنئے:

"اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی

رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج وغم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضور تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپ کبھی میرے پاس نہیں بیٹھے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ اور ام رومان (حضرت عائشہؓ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے اس لئے وہ دونوں بھی پاس آکر بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ عائشہؓ مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری برأت ظاہر فرمادے گا۔ اور اگر تم کسی گناہ میں مبتلا ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے (بے گناہ آدمی سے اسی فطری کیفیت کی توقع کرنی چاہیے۔ (ن۔ ص) میں نے اپنے والد سے عرض کیا: آپ رسول اللہؐ کی بات کا جواب دیں۔ انہوں

نے فرمایا۔ بیٹی! میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں
اپنی والدہ سے کہا۔ آپ ہی کچھ کہیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا، کیا
میں حیران ہوں کہ کیا کہوں۔ اس پر میں بولی۔ آپ لوگوں کے
کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب
اگر میں یہ کہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ
میں بے گناہ ہوں۔ تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ مخواہ
ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی...... اور اللہ
جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی...... تو آپ مان لیں گے۔ میں نے
اس وقت حضرت یعقوب کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ آیا
(ایک بے گناہ جب کسی بھاری الزام کی زد پر آ کر لاینحل
اضطراب میں پڑتا ہے تو اس کے عام نفسیات میں ایسے ہی
حوادث صادر ہوتے ہیں۔ ن۔ ص) آخر میں نے کہا، اس
حالت میں میرے لئے اس کے سوا، اور کیا چارہ ہے کہ وہی
بات کہوں جو حضرت یوسف کے والد نے کہی تھی کہ فصبر

جمیل (اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جبکہ حضرت یعقوب کے
سامنے ان کے بیٹے بن یمین پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا)
یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ (بے بسی
اور اس کے ساتھ یہ عالم بے نیازی پھر اسی نفسیاتی کیفیت کو
ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ کسی بے گناہ پر الزام چپکا یا گیا ہو۔ ن۔ص)
اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی میرے وہم وگمان میں بھی نہ
تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی
جائے گی میں اپنی ہستی کو اس سے کمتر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری
طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میرت برائت
ظاہر فرمادے گا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری
ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ سخت
جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ کے چہرے
سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہوگئے۔

میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو

بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اللہ کیا حقیقت کھولتا

ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضورؐ بے حد خوش تھے۔ آپ

نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہؓ!

اللہ نے تمہاری برأت نازل فرما دی۔ اور اس کے بعد حضورؐ نے

دس آیتیں سنائیں۔ میری والدہ نے کہا کہ اٹھو اور رسول اللہؐ کا

شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا۔ میں نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی اور

نہ آپ دونوں کا! بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتی ہوں۔ جس نے میری

برأت نازل فرما دی۔ اور اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں

سنائیں۔ میری والدہ نے کہا کہ اٹھو اور رسول اللہؐ کا شکریہ ادا

کرو۔ میں نے کہا۔ میں نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی اور نہ آپ

دونوں کا! بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتی ہوں۔ جس نے میری برأت

نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا''۔

(تفہیم القرآن۔ ماخوذ از ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۵۴ ۔عدد ۰

(ص ۱۰-۹)

ذرا یہ شکوہ بھرا غیورانہ اندازِ گفتگو ملاحظہ ہو کیا یہ کسی مجرم ضمیر کی ترجمانی کرتا ہے؟ (ن-ص)

اس آپ بیتی کا ہر ہر لفظ بول کر کہہ رہا ہے کہ یہ ایک بے گناہ کی داستانِ درد ہے جو ہر تصنع سے پاک ہے اور جس میں حقیقی کرب کا بے ساختہ اظہار ہے۔

تبصرہ، تجزیہ اور تزکیہ

پروپیگنڈہ کے اس طوفان اور اس کے پیدا کردہ بحران (Crisis) کی اتھاہ تاریکیوں کا توڑ کرنے کے لئے یکایک افقِ وحی چمک اٹھا۔ معاشرے کے ذہنی عالم میں صبحِ الہام نمودار ہوئی اور آیاتِ بینات کی کرنیں روحانی فضاؤں میں رقص کرنے لگیں۔ کیا ہی خوب مناسبت تھی کہ جو سورۃ اس بحران کا ازالہ کرنے اتری، اس کا نام سورۃ نور قرار پایا۔ اس سورۃ میں

جماعت اور معاشرہ پر تبصرہ کیا گیا۔ اس کی کمزوریاں واضح کی گئیں۔ اور ان کمزوریوں سے اسے مستقل طور پر پاک کر دینے کے لئے قانونی اور اخلاقی ہدایات دی گئیں۔

اس معرکہ آرا سورۃ کے مضمون کی اٹھان ہی چونکا دینے والی ہے۔ فرمایا گیا:

"یہ ایک سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے اور جسے ہم نے ذمہ داری کے طور پر...... (اسلامی معاشرے کے لئے) لازم ٹھہرایا ہے اور جس میں ہم نے نہایت واضح باتیں پیش کر دی ہیں۔ شاید کہ تم لوگ ان سے استفادہ کرو"! (آیت۔ ۱) اب سورۂ نور کی صدا معاشرے میں گونجتی ہے۔

"جو لوگ یہ بہتان گھڑ کر لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں...... جس نے اس میں جتنا حصہ لیا۔ اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا۔ اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا۔

اس کے لئے تو عذابِ عظیم ہے"۔ (آیت ۔ ۱۱)

کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک بے ثبوت الزام جس کے لئے کوئی واضح قرینہ تک موجود نہ تھا۔ وہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور کسی بیرونی دشمن اور حریف کی طرف سے نہیں، بلکہ خود برسوں تک کی تربیت یافتہ مسلم جماعت کے اپنے اندر سے اٹھا۔ پھر یہ ایک آدھ آدمی کی وقتی لغزش نہ تھی، مہینہ بھر تک ایک ٹولے کا ٹولا ذہنی مدوجزر پیدا کرتا رہا۔ بتایا جارہا ہے کہ تمہارے جماعتی ماحول میں یہ کمزوری موجود ہے کہ اس کے معماری اس کی تباہی کی مہم چلادیں۔ اس فضاء میں ایسے رخنے ہیں کہ علمبرداران صداقت کی سوسائٹی میں جھوٹ برگ وبار لائے۔ فرمایا جارہا ہے کہ یہ بہتان نہیں تھا۔ عصیاں کی ایک بہتی گنگا تھی جس سے کسی نے خم اور کسی نے جام بھرا۔ اور کسی نے چلو ہی لیا...... سو جس نے جتنا بھی حصہ لیا اپنے لئے برائی ہی کمائی۔ پھر اشارہ کیا گیا اس سرخیلِ فتنہ اور اس امامِ شر کی طرف جس نے پہلی

چنگاری ڈالی تھی اور پھر برابر شعلوں کو دامن سے ہوا دیتا رہا۔ یعنی عبداللہ بن ابی۔

سورۂ نور سوال کرتی ہے کہ:

"جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ ایمان والے مردوں وار ایمان والی عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے"؟ (آیت۔ ۱۲)

کتنا اخلاقی اپیل ہے اس میں..... شریفانہ جذبات اور مومنانہ حس کے لئے کتنا تیز کچوکا ہے ان الفاظ میں! مدعا یہ ہے کہ محض اتنی سی بات کہ اسلامی معاشرہ کی ایک شریف ترین خاتون قافلے سے بچھڑ جاتی ہیں اور اسی معاشرے کا ایک دوسرا معزز رکن ان کو راستے میں پا کر ساتھ لے آتا ہے۔ تمہارے لئے درجہ آخر کی بدگمانی کی بنیاد کیوں بن گئی؟ کیا تم میں سے

کوئی مرد وعورت ایک اتفاقی حادثے کے طور پر اس صورت سے دوچار ہوتا تو وہ لازماً اسی پستی میں گرتا؟ کیا اپنے اخلاق وکردار کے بارے میں تمہارا اندازہ یہی تھا؟ کیا تمہارے معاشرے کی سطح اتنی گری ہوئی ہے کہ اس کے دوفرد اگر اتفاقاً علیحدگی میں رہ جائیں تو وہ بدکاری سے ورے ورے نہیں رک سکتے! اگر تم اپنے بارے میں اس پستی کا تصور نہیں کرسکتے تو تمہیں اپنی جماعت کی ایک بہترین خاتون اور اس کے ایک ممتاز رکن کے بارے میں ایسا ذلیل تصور باندھنے کا کیا حق تھا؟

اور اس معاشرے کی بڑی اکثریت اس دورِ بحران میں بھی اپنی اخلاقی عظمت پر قائم تھی۔ ورنہ اگر سارا جسم اس زہر کو قبول کرلیتا اور اس کی ذہنی مدافعت کرنے میں عاجز رہ جاتا تو یہ حملہ اس کا شیرازہٗ وجود بکھیر کر رکھ دیتا۔ کتنا صحیح ردِعمل تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا، جب ان کی بیوی نے ان سے ان گندی افواہوں کا تذکرہ کیا۔ وہ کہنے لگے: "ایوب کی ماں!

اگر تم عائشہؓ کی جگہ اس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں''؟ وہ بولیں۔ ''خدا کی قسم! میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی''۔ حضرت ابو ایوبؓ نے کہا ''تو عائشہؓ تم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوان کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کرسکتا تھا۔ صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے''۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۸۔۳۳۷)

سورۂ نور اس گندے بہتان کو پھیلانے والوں کا دامن پکڑ کر پوچھتی ہے کہ آخر تمھیں کیا ہوگیا تھا۔ تم نے کیوں نہ ابوایوب انصاری کا سا ردعمل دکھایا؟

اس کے بعد سورۂ نور قانونی نقطہ نظر سے سوال اٹھاتی ہے کہ:

''وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں''۔ (آیت ۔۱۳)

یعنی کسی مرد و عورت کی عصمت کے دامن پر دھبہ ڈالنا محض ایک دل لگی نہیں ہے، یہ ایک سنگین معاملہ ہے اور اس پر ایک زندہ نظام معاشرہ میں قانونی کارروائی واجب ہو جاتی ہے۔ جس طرح کسی شریف شہری کے بارے میں اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ اس نے قتل کیا ہے، اس نے چوری کی ہے، اسی طرح ...... بلکہ اس سے بڑھ کر ...... یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں شخص نے بدکاری کی ہے، ایک سرسری سی بات نہیں ہے کہ آئی گئی ہو جائے، یہ انتہائی ذمہ دارانہ احساس چاہتی ہے۔ ایسے الزام لگانے پر ان کا ثبوت دینا اور ان کے لئے قانونی شہادت فراہم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اب جو لوگ اسلامی معاشرہ کے دو شریف اور معزز شہریوں کے متعلق اپنی آنکھوں سے کوئی بات دیکھے بغیر محض افسانہ طرازی کے طور پر ایک بہتان کا چرچا کرتے پھر رہے ہیں، ان کا فرض یہ ہے کہ وہ ثبوت اور شہادت لائیں۔ ورنہ قانون کے مطابق وہ خود جھوٹے اور مجرم ہیں۔

پھر سورۂ نور مسلم معاشرہ کے کمزور عنصر کی کمزوری کو

نمایاں کرتی ہے کہ:

"ذرا غور کرو، اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے، جبکہ

تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی

جارہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جارہے تھے جس کے

متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا، تم نے اسے ایک معمولی بات سمجھا۔

حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات ہے۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی

تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں

دیتا۔ سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے"۔ (آیت۔۱۵۔۱۶)

یہ کسی بھی معاشرے اور کسی بھی نظام جماعت کی......

خصوصاً جبکہ وہ دنیا بھر کی اخلاقی اصلاح کے لئے قائم ہوا ہو۔

اور اس کے زیر اثر ایک تمدنی وسیاسی تحریک بھی چل رہی ہو......

بڑی بھاری کمزوری ہے کہ اس میں بے سروپا اور بیہودہ اور غیر

ذمہ دارانہ باتوں کا آسانی سے چلن ہو سکے۔ کان جو کچھ سنیں،

اٹھا کر دل میں رکھ لیں اور دل زبانوں کے حوالے کر دیں اور زبانیں آگے منتقل کرتی چلی جائیں۔ کوئی غور و تامل نہ ہو، کوئی تحقیق نہ ہو، کوئی رد و کد نہ ہو، اور کسی جگہ جا کر سلسلہ رکے نہیں۔ جو جس شخص کے خلاف جیسے کچھ کلمات بھی کہنا چاہے، بالکل جھوٹ ہو، جو جس کی پگڑی اچھالنا چاہے اسے پوری آزادی ہو اور جو جس کے دامن عفت کی دھجیاں بکھیرنا چاہے ماحول اسے وسیع موقع بہم پہنچا دے۔ کیسا چمن افکار و کردار ہوگا؟ جس میں فتنہ کا مالی کانٹے بوتا رہے اور زبانوں کی کیاریاں کانٹے اگاتی رہیں۔ جس معاشرہ میں سرور عالمؐ اور عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور صفوانؓ جیسی ہستیاں ایک منافق کے چھوڑے ہوئے شوشے سے محفوظ نہیں رہ سکتیں اس میں اور کس کی عزت و آبرو کی خیر ہوگی۔

سورۂ نور کی آواز میں ایک گونج اور پیدا ہوئی:

"جو لوگ پاک دامن اور بھولی بھالی ایمان دار عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے"۔ (آیت ۲۳)

اس آیت میں تو گویا حضرت عائشہؓ کے کردار کی تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی۔ ایک ایماندار اور پاک دامن خاتون جو مزاج کی سیدھی سادی تھیں اور جن کو تصور تک نہ تھا کہ بدچلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے اور جن کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی یہ اندیشہ نہ گذرا ہوگا کہ کوئی ان پر بھی ایک گھناؤنا الزام لگا دے گا۔ اس آیت میں ان کی مظلومیت پوری طرح بول رہی ہے۔ مظلومیت کی یہ تصویر اخلاقی طور پر ایک ایک دل کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔

بدقسمتی سے جو مخلص، ایماندار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعت اور تحریک کے وفادار افراد اس سیل تند و تیز میں بہہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ ہستی بھی جس نے تحریک کی

بڑی خدمات انجام دی تھیں اور جس نے اس کے فکری و ادبی سرمایے میں اضافہ کیا تھا۔ یہ تھے حسان بن ثابت۔ سورۂ نور کی الہامی شعاعیں جن حساس لوگوں کے دلوں میں نشتر بن کر اتر رہی تھیں، آج حسان بھی ان کے زمرے میں تھے۔ ان کا مرتبہ دائرہ تحریک اور دربار نبوت میں خاصا بلند تھا۔ مختلف مواقع پر حضورؐ بطور خاص فرمائش کرتے اور توجہ دلاتے کہ شعر و ادب کی جاہلی طاقت کے حملوں کا جواب شعر و ادب ہی سے دیں اور اسلام کی ترجمانی کریں۔ اس سعادت کا تصور کیجیے کہ محسنؐ انسانیت نے حسان کو خود منبر پر بٹھایا کہ وہ اسلامی تحریک کا ترانہ الاپیں۔ ان کے اسی مرتبہ کا لحاظ خود عائشہؓ کو اس قدر تھا کہ اس بحرانی دور کے گزر جانے کے بعد وہ ہمیشہ ان کی عزت کرتی رہیں۔ بسا اوقات ان کو یاد دلایا جاتا کہ اس شخص نے آپ کے خلاف کیچڑ اچھالنے کی مہم میں حصہ لیا تھا، تو وہ شرافت نفس کے انتہائی بلند مقام سے فرماتیں کہ جانے دو۔ انہوں نے مخالف اسلام

شعراء کو رسول اکرمؐ اور اسلامی تحریک کی طرف سے ہمیشہ پرزور جواب دیا ہے اور شاعری کے محاذ پر خاصا جوہر دکھایا ہے۔

لیکن امر واقعہ بہر حال یہی ہے کہ تحریک اسلامی کے یہ ممتاز فرد...... منافقین کے اٹھائے ہوئے فتنہ کے گھیرے میں آگئے۔ اس بحران میں ان کا...... اپنی جگہ مخلصانہ مگر تحریک کے لئے نہایت مضر...... پارٹ دیکھ کر آدمی یہ درس عبرت حاصل کرتا ہے کہ نہ کوئی بہتر سے بہتر شخص اپنے بارے میں یہ ضمانت رکھتا ہے کہ وہ مغالطے کے کسی چکر میں نہ پڑے گا، اور نہ دوسری نمایاں ترین شخصیتوں کے بارے میں وہ بے فکر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی فتنے کے گھیرے میں نہ آئیں گے۔ ہر انسان، بڑا ہو یا چھوٹا ہر وقت شیطان کی کمان سے نکلنے والے تیروں کی زد میں ہے۔ بلکہ فتنے ہر اہم اور بڑے آدمی کے گرد گھیرا ڈالنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تحریک اسلامی کی دی ہوئی بنیادی فکر یہ ہے کہ اشخاص کے بجائے اصولوں کے گرد جماعت

مجتمع ہو۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے مریدوں کے لئے یہ کتنی بڑی کامیابی تھی کہ انہوں نے تحریک اسلامی کے ایک ممتاز فرد کو شکار کرلیا تھا..... وہ نفاق کے مارے شرانگیزی کر رہے تھے اور حسان بن ثابت اخلاص کے ساتھ ان کے برپا کردہ فتنے کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحریک کے لئے عبداللہ بن ابی کا نفاق اتنا خطرناک اور مضر نہ تھا جتنا حسان بن ثابت کا اخلاص۔ جو اقدام اخلاص اور نیک نیتی سے کئے جاتے ہیں وہ ضرور رسائی میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ بمقابلہ ان اقدامات کا جو دانستہ شرارت کے طور پر کئے جاتے ہیں۔

حسان بن ثابت اس بات کا احساس نہ کر سکے کہ وہ کن لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں وہ کیسے افراد کے نقطہ نظر کو پھیلا رہے ہیں۔ وہ کن شخصیتوں کے خیالات و عزائم کی ترجمانی

کر رہے ہیں اور ان کی حرکات وسکنات معاشرے کے کس عنصر کی حمایت میں جاری ہیں اور جماعت کی کسی ٹولی کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں۔ مشیت ربانی تھی کہ وہ اس معاملہ میں فراست مومن سے کام نہ لے سکے۔

عبداللہ بن ابی کے ساتھ اسلامی معاشرہ کا معاملہ دوری اور بیگانگی کا تھا۔ اس کی گلوخ اندازی قابل برداشت تھی لیکن حسان بن ثابت سے جماعت کی جو یگانگت تھی، اس کی وجہ سے جذبات میں کھولاؤ پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے نیام کی ایک تلوار ہمارے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ یہ صورت جب کسی تحریک اور تنظیم میں پیدا ہوتی ہے تو صبر کے پیمانے لبریز ہو جاتے ہیں۔ صبر کے پیمانے لبریز ہوئے ہوں گے مگر مسلم جماعت کا کڑا اخلاقی ڈسپلن جذبات کے آگے روک بنا کھڑا تھا۔ ایک شخصیت ایسی تھی جو ضبط برقرار نہ رکھ سکی۔ یہ صفوان بن المعطل تھے۔ جن کو ایک طرف یہ صدمہ تھا کہ حضرت عائشہؓ جو

ان کے لئے بمنزلہ ماں کے تھیں ان پر تہمت لگائی جارہی تھی۔

اور دوسری طرف یہ کرب کہ افسانے کی خدمات سرانجام دی تھیں جو جنتی سپاہی ہونے کے لحاظ سے معروف تھا۔ جس کے کردار میں آج تک کوئی آثار فسق وفجور نہ پائے گئے تھے اور جس نے ایک شرمیلے بیٹے کی حیثیت میں حضرت عائشہؓ کو دیکھے بغیر اور سارے راستے بات کئے بغیر پوری احتیاط کے ساتھ پچھلے پڑاؤ سے لشکر گاہ تک پہنچایا تھا۔ ان کا خون اس زیادہ پر بری طرح کھولا۔

صفوان نے حضرت حسان کے کچھ اشعار سنے جو منافقین کے لگائے ہوئے بہتان عظیم پر مشتمل تھے، زبان حضرت حسان کی تھی جسے وقتی طور پر اشرار کے خیالات نے مستعار لے لیا تھا۔ فن ان کا تھا اور ذہن غیروں کا بول رہا تھا۔

صفوان کی ان سے جھڑپ ہوگئی اور انہوں نے تلوار

سوار کر دیا۔ ثابت بن قیس بن شماس نے موقع پر بچاؤ کیا اور صفوان کو پکڑ کر باندھ لیا اور بنی حرث کی حویلی میں لے گئے۔

آخر یہ قضیہ محسنؐ انسانیت کی خدمت میں پہنچا۔ حسان اور صفوان دونوں کی طلبی ہوئی۔ صفوان نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! اس شخص نے مجھے اذیت دی ہے اور میرے حق میں سخت بدگوئی کی ہے۔ سو مجھ پر غصہ آسوار ہوا اور میں نے اسے مارا"۔ آپؐ نے ملامت سے حسان کو سمجھایا بجھایا اور بعد میں صفوان کی طرف سے تلوار کے زخم کے بدلے دیت دلوائی۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۳۔ ص ۳۵۲)

صفوان کی غیرت چونکہ بالکل فطری تھی۔ حسان بن ثابت نرم پڑ گئے اور خدا نے ان کو اس خطرے سے بچا لیا کہ وہ کسی غلط جذبے کی رو میں آگے بڑھتے چلے جاتے اور تحریک کے لئے مزید موجب ضرر ہوتے۔

حضرت حسان کا یہ جذبہ ندامت آخر ایک قصیدے کی

صورت میں ڈھل پڑا جس میں شعر کے پانی سے انہوں نے اپنے

ہی لگائے ہوئے دھبے کو حضرت عائشہ کے دامن پاک سے

دھونے کی کوشش کی۔ کیا خوب فرمایا:

حصان رزان ما تزن بریبة

وتصبح غرثی من لحوم الغوافل

مهذبة قد طیب الله خیمها

وطهرها من کل سوء وباطل

فان الذی قد قیل لیس بلائط

ولکنه قول امرئ بی ماحل

"وہ ایک عفت مآب خاتون ہیں۔ پردہ نشین۔ ہر شک وشبہ سے

بالاتر۔ وہ اس سے پاک ہیں کہ بھولی بھالی عورتوں کے عزت و

ناموس سے تعرض کریں...... وہ شائستہ اطوار ہیں۔ خدا نے ان کو

مزاج کے لحاظ سے نکھارا اور نتھارا ہے اور ان کو گناہ اور باطل سے

پاک کیا ہے، وہ جو کچھ کہ اب تک کہا جا چکا ہے وہ موصوفہ پہ
چسپاں ہونے والا ہرگز نہیں ہے، وہ تو ایک ایسے شخص کی کہی ہوئی
بات تھی جس نے میرے سامنے نمک مرچ لگا کر اور جھوٹ گھڑ
کر چغلخوری کی تھی"۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۳ ۔ ص
۳۵۳۔۵۴)

پھر سورۂ نور نے ایک معاشرتی حقیقت کو اصولی
استدلال کے طور پہ مسلم جماعت کے سامنے کھول کر رکھا کہ:

"خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد
خبیث عورتوں کے لئے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے
ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے۔ ان کا دامن پاک
ہے ان باتوں سے جو گھڑنے والے گھڑتے ہیں"۔ (آیت۔
۲۶)

یعنی ازدواج کے لئے یوں بھی ذہنی و اخلاقی لحاظ سے

جوڑ تلاش کیا جاتا ہے۔ اور نفسیاتی طور پر آدمی کی نگاہ انتخاب وہیں ٹکتی ہے جہاں اسے اپنے کردار کا عکس نظر آتا ہے۔ خصوصیت سے کسی اصول و مقصد کو لے کر جو لوگ ساری متاع حیات اس میں لگا دیتے ہیں وہ ازدواجی رابطے کے لئے بھی ایسا ہی رفیق تلاش کرتے ہیں جو زندگی کے مشن میں ممد اور مفید ثابت ہو سکے۔ پھر عالمگیر پیمانے کی یہ تجربی صداقت کیسے نظر انداز کی جا سکتی ہے کہ نبھاؤ اور صلح و سازگاری کسی جوڑے میں تبھی ہوتی ہے کہ قلب و نظر کو جوڑ میل پیدا ہو جائے اور ذہن و کردار میں یکسانی ہو۔ ورنہ ام اول تا آخر تصادم رہے گا۔ یہ آیت بہتان طرازوں کو دعوت فکر دیتی ہے کہ تم نے یہ نہ دیکھا کہ داعئ ازدواج میں تحریک اسلامی کے بلند مرتبت رہنمائی کی نگاہ انتخاب جس ہستی پر پڑی تھی۔ جس سے گہرا قلبی لگاؤ تھا اور جس کے ساتھ قلب و نظر کی سازگاری و ہم آہنگی ایک معیاری نمونہ تھی اور کیا تمام تر ملمع کا کرشمہ تھی کہ ایک ان میں ملمع اتر گیا۔

اور کھوٹ باقی رہ گیا۔

ایک پاکیزہ گھرانے کی نور چشم جس کے ماں باپ تحریک اسلامی کے اولین علمبرداروں میں سے تھے اور جس کا بچپن ہی تحریک کی ٹھنڈی گھٹاؤں کے سائے میں تربیت فکر و نظر پاتے گزرا۔ پھر جسے سرکار رسالت مآب کے ساتھ یکجائی کا شرف حاصل ہوا۔ جسے قریب ہوکر آپ کے نورانی کردار سے استفادہ کرنے کا سب سے بڑھ کر موقع ملا جسے محسن انسانیت کی تربیت کا فیضان خاص حاصل ہوا اور جس کے حجرے میں بار ہا وحی والہام کی کرنوں کی بوچھاڑیں ہوتی رہیں۔ کیا ایسے پاکیزہ ماحول کے سانچے میں ڈھلی ہوئی خاتون کا کردار ایسا ہونا چاہئے تھا کہ ایک غلیظ ترین بہتان کا جامہ اس کے قامت پر راست آجائے درآنحالیکہ اس کے والدین کو اور نہ سرور عالم کو اور نہ عام معاشرے کو اس بارے میں اس بہتان طرازی سے قبل ایسا کوئی اندازہ ہوسکا ہو۔ برسوں سے ایک کردار جو حسن و پاکیزگی کے

خطوط پر ارتقاء کرتا رہا ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ یکا یک اس کے اندر سے ایک بدترین قسم کی گھناؤنی حرکت نمودار ہو جائے جس کے کوئی ابتدائی آثار کبھی کسی کے سامنے نہ آئے ہوں۔ ایک شجرۂ طیبہ کمال شادابی کے ساتھ پاکیزہ برگ وبار دیتے دیتے یکا یک ایک دن خبیث پھل لے آئے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے؟

قانون حرکت میں آتا ہے

سورۂ نور کی روشنی سے اہل ایمان کے دلوں کی نگریاں جگمگا اٹھیں، رائے عام یکسو ہوگئی۔ معاشرہ نے مدوجزر کے ایک لمبے دور کے بعد اپنی سطح کو پرسکون اور ہموار کرلیا۔ سورۂ نور حد قذف کے قانون کا کوڑا اپنے ساتھ لائی تھی۔ سو جن جن اصحاب نے سرگرمی سے بہتان طرازی کی اس مہم میں حصہ لیا تھا اور جو اپنے اخلاص کی وجہ سے نادم ہو کر جرم کے اقراری بھی ہوئے اور جن کے بارے میں شہادت بھی موجود تھی انہوں نے اپنی

پہنچیں اسلامی عدل و قانون کے سامنے پیش کر دیں اور اسی اسی
کوڑے کھا کر انہوں نے اپنے ضمیروں کی پاکیزگی کو بحال
کر لیا۔ یہ تھے مسطح ابن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت
جحش۔

لیکن اصل بانی شر و فساد قانون کی گرفت سے بچ نکلا
......البتہ رائے عامہ کی نگاہ میں اس کی فطرت کی پستی مکمل طور پہ
آشکارا ہو گئی اور اسلامی معاشرے نے اسے بے وقعت بنا کر
ایک طرف ڈال دیا۔

غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں اور کس ماحول اور کس
جماعت میں انبیاء کے خصوصی استثنیٰ کے ساتھ انسانی فطرت
مقام امتحان سے نکل کر عصمت کاملہ کی قدسیانہ سطح پر پہنچ سکتی ہے
لیکن قصہ آدم کے دو متقابل کرداروں کی روشنی میں دیکھیں تو
غلطی سرزد ہو جانے پر غلط کار کے سامنے دو دروازے کھل جاتے

ہیں۔ ایک شیطان کا پسندیدہ راستہ ...... کہ غلطی ہو جانے کے
بعد آدمی اس پر ڈٹ جائے اور الٹا اور بگڑ جائے۔ دوسرا آدم علیہ
السلام کی فطرت سلیم کا پسندیدہ راستہ ...... کہ غلطی ہو جانے کے
بعد نادم ہو کر اپنی اصلاح کر لی جائے سو عبداللہ بن ابی اور اس
کے ساتھی تو شیطانی راستے کی طرف مڑ گئے اور حسان اور مسطح اور
حمنہ نے اصلاح کا راستہ اختیار کیا۔

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

سلسلۂ واقعات کو نگاہ تصور میں تازہ کریں اور اپنے
آپ کو مدینہ کے اس ماحول میں لے جائیں جس میں یہ بہتان
کا جھگڑا مہینہ بھر تک چلتا رہا تھا تو ایک ہولناک اور دردناک سماں
سامنے آتا ہے ایک تحریک جو ایک ایک فرد کو آہستہ آہستہ ساتھ
لے کر ایک چھوٹے سے کاروان انقلاب کی شکل اختیار کر سکی تھی
جس نے کتنی ہی صبر آزما منزلوں کو پار کر کے اسلامی ریاست کا

ایک چھوٹا سا گھروندا انسانیت کو پناہ دینے کے لئے سالہا سال کے لمبے دورِ فساد کے بعد کرۂ ارضی کے ایک گوشے میں تیار کیا تھا جو چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں تھی اور جس کو ہر آن کسی نہ کسی جانب سے فوج کشی کا خطرہ تھا اور جو خود اپنے نومسلم شہریوں کی ایک بڑی تعداد کی شرارتوں کے گھیرے میں تھی، اس کے بالکل اندر سے اگر ایک تباہ کن طوفان اٹھ پڑے تو اس سے بڑھ کر اور کون سا موقع اضطراب ہو سکتا تھا۔

لیکن قرآن نے تسلی دلائی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ...... "اسے اپنے حق میں موجب ضرر نہ سمجھو یہ تو تمہارے لئے بھلائی کا ذریعہ ہے"۔ (نور۔۱۱)

اور واقعہ یہ ہے کہ اصولی و انقلابی تحریکوں کے لئے ذہنی شکست و ریخت کے ہنگامے ..... خواہ باہر سے اٹھیں، خواہ اندر سے ..... انجام کار کے لحاظ سے مزید فلاح و ترقی، تعمیر و اصلاح

اور قوت و سطوت کا سامان بن کر رہتے ہیں۔ جس طرح اونچا مقصد رکھنے والے صلاحیت وار افراد کے لئے حوادث روزگار معاون ترقی ہوتے ہیں۔ اسی طرح روح فکر و عمل رکھنے والی تحریکوں کے لئے مخالفتوں اور مزاحمتوں اور فتنوں کے طوفان وسیلہ استحکام وارتقا بن جاتے ہیں جس نظام جماعت میں نصب العین کا شعور کارفرما ہو، جس کا ایک اجتماعی ذہن بن چکا ہو، جس کا فکری و اخلاقی مزاج پختہ ہو چکا ہو، جس کے سر پر ایک فعال اور بیدار مغز قیادت بیٹھی ہو اور جس میں فتنوں اور مخالفتوں کے ہر مدوجزر پر نظر رکھنے والے طوفانوں کو تہہ تک پڑھ لینے والے اور ان کے مقابل میں سینہ سپر ہو جانے والے مضبوط کارکن موجود ہوں اور جس کی رائے عام کسی فاسد نظریہ و اقدام کو اپنے دائرے میں چلنے نہ دے۔ ایسا نظام جماعت ہر مخالفت و شرارت سے بھی کچھ کما کر نکلتا ہے۔

چنانچہ پروپیگنڈے کے اس گندے طوفان کی موجوں

سے بھی مدینہ کی عظیم المرتبت اسلامی جماعت نے کئی پہلوؤں سے اپنے دامن میں خیر و فلاح کے موتی سمیٹے اور وہ اس سے نکلی تو پہلے سے زیادہ مضبوط اور پہلے سے زیادہ چاق و چوبند تھی۔

نیکی اور سچائی کی اس نورانی تحریک کے علمبرداروں کو انسانیت کی ان خطرناک اور وسیع الاثر کمزوریوں کا علم براہ راست تلخ تجربے کے ذریعہ ہوا جس کا تصور بھی کسی خانقاہ میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے انسانی سیرت کو تیار کیا جا سکتا ہے۔ جماعتی زندگی کے وہ رخنے پوری طرح سامنے آ گئے، جن میں سے معاشرے کو تہہ و بالا کر دینے والے مفاسد کا داخلہ ہوتا ہے۔ حضور سرورِ عالم اور ان کے رفقاء کے سامنے جماعت کے مختلف عناصر ...... نفاق کے روگی، ضعیف الایمان لوگ، سطحی اور جذباتی مزاج رکھنے والے، نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط رَو میں بہہ جانے والے اور دشمنوں کا شکار ہو جانے والے سادہ لوح افراد بھی الگ الگ نمایاں اور ممیز

ہو گئے خصوصیت سے نفاق کے شیطان نے جماعت کے اندر جو ایک الگ ٹکڑی منظم کر دی تھی اس کے بارے میں پوری طرح وضاحت ہو گئی کہ وہ کہاں تک جا سکتی ہے۔

عملی تجربے کے میدان میں جماعت کے اندرونی ماحول کی ان کمزوریوں کے سامنے آ جانے سے وہ خاص ذہنی کیفیت پیدا ہوئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف نئی اخلاقی ہدایت دے کر تربیت کا انتظام کیا گیا اور دوسری طرف ایسے معاشرتی احکام کا نفاذ کیا گیا جو کہ کئی مفاسد سے جماعت کو بچانے کا ذریعہ ہو سکتے تھے۔ تیسرے طرف نئے قوانین اور حدود و تعزیرات پر مشتمل ایک کڑا ضابطہ نازل ہوا جو ہمیشہ کے لئے انسانیت کی اجتماعی فلاح و بہبود کا ضامن بنا۔

اس واقعہ نے مدینہ کی سوسائٹی کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ اس کی اخلاقی حس کو چوٹیں لگا کہ بیدار اور اس کی جماعتی حمیت و

غیرت کو تازیانے برسا کر متحرک کر دیا۔ پوری جماعت نفاق کے اس اضطراب انگیز حملے سے نکلی تو اس کا ایک ایک فرد پہلے سے زیادہ چوکنا اور مضبوط تھا۔

اس ہنگامے کے طوفان سے گزرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کے ساتھ سب سے زیادہ مظلوم ذات خود محسنِ انسانیت کی تھی۔ لیکن جس عالی ظرفی، حوصلہ مندی اور صبر و تحمل کا مظاہرہ حضورؐ نے اپنے ٹھنڈے غیر جذباتی اور باوقار طرزِ عمل سے کیا۔ وہ انسان کو حیرت میں ڈال دینے والا ہے اور اس میں حضورؐ کے بعد اسلامی تحریک اور نظامِ جماعت کی قیادت کرنے والوں کے لئے ایک جذبہ پرور نمونہ پایا جاتا ہے۔ کس بڑے پیمانے کی ایذا تھی جو سہنے والے نے محض اس قصور میں سہی کہ وہ دنیائے انسانیت کو ایک نظامِ رحمت سے مالا مال کرنا چاہتا تھا جو سارے انسانوں کے ناموس بچانے کے لئے اٹھا تھا، اسے زمانے نے صلہ یہ دیا کہ خود اس کے ناموس پر گندگی اچھال دی۔ کوئی دوسرا

اس چکر میں پڑا ہوتا تو یا تو مخالفین کو پیس کر رکھ دیتا یا پھر بیزار اور مایوس ہوکر گوشہ نشین ہو جاتا۔ مگر وہ پیکر صبر و عزیمت فرض کی راہ پر چلتا رہا، چلتا رہا...... کانٹے اس کے قدموں کو لہولہان کرتے رہے اور وہ پھر بھی آگے ہی بڑھتا رہا۔

شرانگیزیاں

مدینہ کے یہودی قبائل ایک طرف اپنی جمعی جمائی قوت کے زعم میں اور دوسری طرف سیاسی ضرورتوں کے تحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دستوری معاہدہ کے پابند ہوکر اسلامی ریاست کے نظم میں آچکے تھے۔ اول تو وہ اس نئی سیاسی ہیئت کو وقت پر پوری طرح سمجھ بھی نہ پائے ہوں گے پھر ان کو اس کے روشن مستقبل کا مشکل ہی سے کچھ اندازہ ہو سکا ہوگا کہ یہ انتہائی تیز رفتاری سے نشوونما پائے گی اور جذبے خانماں فراد مدینہ کے انصار کے تعاون سے ایمان و کردار کے بل پر

تاریخ کی باگ ڈور تھامنے والی قوت بن جائیں گے۔ ان کے

اندازے یہ ہوں گے کہ شاخسار وطن سے ٹوٹ کر گرنے والی یہ

چند مسلی ہوئی خشک پتیاں اول تو حادثات کے جھونکوں میں

اڑ جائیں گی۔ اور اگر یہ پڑی بھی رہیں تو ان سے کوئی چمن

شادابی تو وجود پانے کا نہیں...... مگر کلمہ طیبہ کی عظیم انقلابی روح

کا اعجاز تھا کہ مخالفتوں بھرے ماحول میں گھری ہوئی ان چند

جانوں سے ایک پرزور سیاسی ہیئت تشکیل پاتی چلی گئی اور چند

مہینوں کی گردشوں میں یہود کو اندازہ ہوگیا کہ اسلامی ریاست

ایک ایسا چڑھتا سورج ہے کہ جس کے سامنے ان کے اثر ورسوخ

کی مشعلیں روشن نہ رہ سکیں گی خصوصاً جنگ بدر سے اسلامی

تحریک کا نہ صرف زندہ و سلامت بچ نکلنا بلکہ علم فتح لہراتے

ہوئے مدینہ پلٹنا یہود کے لئے ایسا مبہوت کن واقعہ تھا کہ یقیناً وہ

سارے معاملے کو ازسرنو سوچنے پر مجبور ہوگئے ہوں گے۔

معاہدانہ تعلق نے ان کو اسلامی ریاست کا حلیف بلکہ

پابند دستور و قانون شہری بنادیا تھا لیکن ان کی روحیں حریفانہ و باغیانہ رجحانات سے بھرپور تھیں۔ مارے حسد کے ان کے جگر اندر ہی اندر کباب ہوئے جاتے تھے۔

اس متضاد پوزیشن نے ان کو فتنہ انگیزی کی راہ پر ڈال دیا۔ وہ ہر موقع سامنے آنے پر بلکہ خود ایسے مواقع پیدا کر کرکے یہ کوشش کرتے کہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کی وحدت پارہ پارہ ہو۔ کسی طرح مسلمانوں کی اشتعال کی راہ پر ڈال دیا جائے۔ کسی طرح نظم کو معطل کیا جائے۔ لاء اینڈ آرڈر کو غارت کیا جائے اور بحران پیدا کر دیا جائے۔ کسی طرح حضورؐ کی قیادت کو کمزور کر دیا جائے۔ ان لوگوں کے اپنے آدمی نفاق کا جامہ اوڑھ کر مسلم معاشرہ کے اندر موجود تھے اور وہ انصار میں سے ضعیف الایمان لوگوں کو ملا کر یہود کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے تھے۔

ان کینہ توز دشمنوں کی نظر بندی نے ایک راہ یہ نکالی تھی کہ یہ لوگ مسلم خواتین کے نام لے لے کر فحش اشعار کہتے اور ان کو پھیلاتے۔ ان کے ناموس کو رسوا کرنے کی کوشش کرتے۔ اس گندی شاعری نے ان کے ذہنوں کو اس طرح پرنشوونما دی کہ عصمت جیسی بنیادی تہذیبی قدر کا احترام بھی ان کے دلوں سے اٹھ گیا۔ یہود کے اس حیاباختہ ذہن کا اظہار ایک موقع پر ایسے ہوا کہ کچھ یہودی افراد بالکل بازاری غنڈوں کی سطح پر اتر آئے تھے۔ بنو قینقاع کی ایک مستقل آبادی مدینہ کا ایک جز تھی۔ ان کے بازار میں ایک مسلمان عربی عورت سودا لینے گئی۔ دوکاندار نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی، اور بالآخر اسے سربازار ننگا کر دیا۔ اس حرکت پر اس کے جلیس شرمندہ ہونے کے بجائے اس کی ہنسی اڑانے لگے۔ عربی طریقے پر وہ چلائی اور اس نے مدد کے لئے صدا بلند کی۔ ایک عربی نوجوان کی حمیت اس کی چیخ سن کر حرکت میں آ گئی۔ اس نے جوش غیرت میں بے قابو

ہو کر بد معاش یہودی کو قتل کر دیا۔ اشارکی مراد بر آئی۔ مسلمان

عربوں اور یہودیوں کے درمیان بلوہ ہو گیا۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی

تو موقع پر تشریف لے گئے۔ بنو قینقاع کو ایسی گندی حرکت پر

ملامت کی اور متنبہ بھی کیا کہ "اے گروہ یہود اپنی اصلاح کر لو

پیشتر اس کے کہ تم کو بھی وہی کچھ پیش آئے جو کچھ کہ (بدر میں)

قریش کو پیش آیا ہے"۔

بنو قینقاع کے سینوں میں چونکہ بروایت ابن سعدؒ بغض و

حسد کے جذبات موجزن تھے اس لئے انہوں نے بہت ہی تندو

تیز لہجے میں جواب دیا کہ "اے محمدؐ! تمہیں اپنے بارے میں اس

بنا پر کوئی مغالطہ نہ ہو کہ تم نے قریش کے کچھ آدمی مار دیئے ہیں

وہ بے طاقت لوگ ہیں۔ وہ لڑنا جانتے ہی نہیں۔ خدا کی قسم اگر تم

نے ہمارے خلاف تلوار اٹھائی تو تم خود جان لوگے کہ ہم ہیں

لڑنے والے لوگ! ہماری طرح کے لوگوں سے تمہیں ہرگز

سابقہ نہیں پڑا"۔ (سیرت ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۷۹)

یہود کو یہ بات بری طرح کھلتی تھی کہ انصار جو ان کے

مقابلہ میں ذہنی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے کمزور تھے۔ اسلامی

تحریک نے ان میں زندگی کی نئی روح دوڑا دی تھی اور ایک

مقدس نصب العین کی لگن نے ان کو آپس میں بھی اور مہاجرین

کے ساتھ بھی وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ یہود کا مشہور زیرک

بڈھا شاس بن قیس حالات کی اس تبدیلی کو بڑی تشویش سے

دیکھتا اور تحریک حق کے علمبرداروں کے خلاف اس کا سینہ حسد اور

کینہ سے بھرا رہتا۔ ایک بار اس نے نبی اکرمؐ کے رفقاء کی ایک

مجلس کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں اوس اور خزرج کے

کچھ لوگ بات چیت کر رہے تھے۔ ان کی باہمی الفت، خیر سگالی

اور اسلام کی پیدا کردہ اجتماعیت کا رنگ دیکھ کر اس کا کلیجہ جل

بھن گیا۔ کجا جاہلیت کی وہ آویزشیں اور کجا یک جانی کا یہ منظر!!

دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اس شہر میں اب قیلہ (انصاریوں کی

جدہ) کی اولاد شیر و شکر ہو گئی ہے۔ یہ لوگ اگر اس طرح مربوط

ہو جائیں تو پھر ہمارے لئے چین حرام ہے۔ اس کے کینہ نے

ایک منصوبہ پکایا اور ایک یہودی نوجوان کو آلہ کار بنا کر تلقین کی

کہ تم جا کر ان لوگوں میں بیٹھو اور ان میں گھل مل کر جنگ بعاث

اور اس سے قبل کے جنگی معرکوں کی یاد تازہ کرو۔ جب کہ اوس و

خزرج لڑا کرتے تھے۔ چنانچہ اس آلہ کار نے اپنا پارٹ بخوبی

ادا کیا۔ ایک مجلس میں اوس و خزرج کے لوگ مل کر بیٹھے تھے۔

جاہلی تاریخ کا تاریک باب ان کے سامنے آیا تو وہی موضوع

گفتگو بن گیا۔ آہستہ آہستہ منافرت ہونے لگی۔ طنز و تعریض کی

جانے لگی تیزی آ گئی دونوں طرف سے جوشیلے جانباز آمنے

سامنے آ کھڑے ہوئے کہ کیوں نہ نئے سرے سے معرکہ لڑ کر

دیکھ لیا جائے کہ کون کیا ہے "ہتھیار لاؤ ہتھیار" کا شور بلند ہوا۔

اوس نے اوس والوں کو پکارا اور خزرج نے خزرجیوں کو! معرکہ

کے لئے جگہ اور وقت کا بھی تعین ہو گیا۔ جوش میں بھرے

ہوئے لوگ تیار ہو کر نکل ہی رہے تھے کہ حضور چند اصحاب

مہاجرین کے ہمراہ موقع پر جا پہنچے اور فرمایا:

اے گروہ مسلمانان! خدا خدا کرو! بعد اس کے کہ خدا نے تم کو اسلام کا راستہ دکھایا۔ اس کے ذریعہ تمہیں سر بلند کیا، تمہاری گردنوں سے نظام جاہلیت کا قلادہ کاٹ پھینکا تمہیں کفر سے نجات دلادی اور تمہارے دلوں کی محبت سے جوڑ دیا، تم میرے موجود ہوتے ہوئے جاہلیت کے نعرے بلند کرنے لگے ہو"؟

یہ تقریر سن کر لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ سارا ہنگامہ شیطانی فتنہ ہے اور دشمنوں کی رخنہ اندازی کا منت کش۔ انہوں نے ندامت سے گردنیں جھکادیں اور مطیعانہ شان سے حضور کے ساتھ واپس ہوئے۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۸۳-۱۸۴)

ایسا ہی ایک موقع غزوۂ بنو مصطلق کے سفر میں آیا جہاں یہود کے آلۂ ہائے کار بننے والے منافقین نے عبداللہ بن ابی

کے حسب ایسا مہاجرین و انصار میں خوف ناک حد تک اشتعال پیدا کر دیا۔ اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ حضورؐ نے اس موقع پر بھی بڑی حکمت سے اس صورت حالات کو سنبھالا۔

اس طرح کے فتنوں میں سب سے بڑھ کر منظم فتنہ وہ تھا جس نے مسجد ضرار کی صورت میں ظہور کیا۔ اس فتنہ کا اصل بانی مبانی قبیلہ خزرج کا ایک شخص ابو عامر راہب تھا۔ حضورؐ کے مدینہ آنے سے قبل یہ اپنے علم کتاب اور تقشف کی وجہ سے بہت با اثر تھا۔ حضورؐ جب مدینے آ کر مرجع خاص و عام بن گئے تو ابو عامر کے اثر و رسوخ کا چراغ گل ہو گیا۔ دل ہی دل میں وہ کڑھتا۔ بدر کے واقعہ نے جو مستقبل اس کے سامنے نمایاں کیا اس کا مشاہدہ کر کے اس کی آنکھوں میں نشتر اتر گئے۔ اس نے ایک طرف جنگ احد کے لئے سرداران مکہ کو اکسایا، دوسری طرف عرب کے مختلف سرداروں سے سازباز کی، تیسری طرف خود انصار کو رسول اکرمؐ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی دعوت

دی، اور چوتھی جانب ہرقل روم کو فوجیں چڑھا لینے کی دعوت دی۔

اس نے منافقین سے یہ ساز باز کی کہ حضورؐ کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متوازی اڈا کھڑا کیا جائے چنانچہ اسی منصوبہ کے تحت مسجد ضرار کھڑی کی گئی۔ اس مرکز فساد کے بانیوں نے حضورؐ سے بڑے ڈرامائی انداز میں یہ درخواست کی کہ ہم نے یہ مسجد ایسے کمزوروں اور معذوروں کے لئے تعمیر کی ہے جو زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ نیز اندھیری راتوں اور بارش اور طوفان کی صورت میں آس پاس کے لوگ اس میں آسانی سے جمع تبوک روانہ ہو رہے تھے، لہذا آپؐ نے اس معاملہ کو واپسی تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ واپسی میں وحی کے ذریعہ آپؐ کو متنبہ کر دیا گیا کہ:

"اور وہ لوگ جنہوں نے (اسلامی معاشرہ کو) ضرر پہنچانے، کفر

کرنے، مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور پہلے سے خدا
اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کو گھات لگانے کا اڈہ
فراہم کرنے کے لئے مسجد کھڑی کی ہے..... اور ہاں وہی جو
قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ (اس کام میں) ہم نے تو فقط نیک
مقاصد ملحوظ رکھے ہیں۔ (ان کی حقیقت یہ ہے کہ) اللہ گواہی
دیتا ہے کہ وہ قطعی طور پر جھوٹے ہیں۔ اس میں آپ ہرگز ہرگز
کبھی قیام نہ فرمائیں۔ ہاں وہ مسجد (یعنی مسجد قبا) کہ جس کی بنیاد
اول روز سے پرہیزگاری (کے جذبات) پر رکھی گئی ہے۔ وہی
زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں (عبادت کے لئے) کھڑے
ہوں اس میں ایسے لوگ ہیں جو اس بات کے خواہاں ہیں کہ
پاکیزگی اختیار کریں۔ اور اللہ پاکیزگی چاہنے والوں ہی کو پسند
کرتا ہے"۔ (توبہ۔ آیات ۱۰۷، ۱۰۸)

مقام عبرت ہے کہ جذبہ حسد و رقابت کا ننھا سا بیج کس
طرح ایک شجرۂ خبیثہ پیدا کرتا ہے، دیکھئے کہ کس طرح اسلامی

تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے کفر بھی ایک مسجد کا خوشنما پردہ فراہم کرتا ہے۔ توجہ دیجئے اس پر کہ دین کو نقصان پہنچانے کے لئے جو فتنے کھڑے کئے جاتے ہیں وہ کس طرح اپنے قامت پر دین وتقویٰ ہی کے جامے راست کرکے نمودار ہوتے ہیں۔ سبق لیجئے کہ کتنی جماعت بندیاں، کتنی خانقاہیں، کتنی مسجدیں کتنے حلقہ ہائے درس، کتنے اشاعتی ادارے اور کتنے جرائد آج بھی ہمارے سامنے نمودار ہوتے اور نشوونما پاتے چلے جاتے ہیں جن میں اسی مسجد ضرار کی سی روح بد کام کررہی ہوتی ہے۔ اور ان کے بانی دعوے یہی لے کر اٹھتے ہیں، کہ "ان اردنا الا الحسنیٰ"۔

اگر یہ مسجد خدا کی عبادت ہی کے لئے بنائی گئی ہوتی، اگر اس کا مقصود معذور مسلمانوں کو نماز کی سہولت فراہم کرنا ہی ہوتا تو یہ ضرورت خود حضورؐ کے سامنے پیش کی گئی ہوتی، اسلامی معاشرہ کی قیادت اس کی تعمیر کا فیصلہ کرتی اور جس طرح دوسری

مساجد پوری جماعت کے اشتراک سے بنی تھیں۔ اسی طرح یہ بھی وجود پاتی۔ جماعت اور اس کی قیادت سے بالا بالا بیٹھ کر کچھ لوگ سرگوشیاں کر کے ایک خفیہ منصوبہ بناتے ہیں وار چپکے سے صحیح معنوں میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کردیتے ہیں ...... درانحالیکہ مسجد قبا اس کے قریب ہی پہلے سے موجود تھی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس متقیانہ کارنامہ کی دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے۔ اسے وحی نے نکال کر معاشرے کے سامنے رکھ دیا۔ کسی مقصد کے لئے کام کرنے والے نظام جماعت کے ہوتے ہوئے کچھ لوگ اس کے اندر اگر اپنی الگ ٹکڑی بنا کے سوچتے ہیں اور مجموعی نقشہ کار سے الگ ہی الگ اپنے منصوبے بناتے اور روبہ عمل لاتے ہیں تو وہ اپنی شان تقویٰ کی بازی کو منوانے کے لئے کتنی ہی لفاظی کرتے پھریں اور کیسے ہی خوشنما بہروپ بھریں نتیجہ بہر حال ضرار، کفر اور تفریق کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ مسجد کے مقدس نام سے قائم ہونے والا یہ ناپاک اڈا فرمان نبوت کے تحت جلا کر راکھ کر دیا گیا تاکہ اس کے ساتھ اس کی منحوس تاریخ بھی ملیا میٹ ہو کر رہ جائے۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۸۵)

مختصر یہ کہ الٰہی ہدایت کے ان ٹھیکیداروں اور انبیاء کے وارثوں نے شر انگیزی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان پریشان کن حرکتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ان کی وہ تخریبی سازشیں تباہ کن تھیں جو ہر موقع جنگ پر اسلامی نظام دفاع کو نقصان پہنچانے کے لئے عمل میں لائی جاتی رہیں۔ ان کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔

نظام انصاف میں رخنہ اندازی

کسی بھی نظام حکومت کا چلنا اس کے دو وظائف کے صحیح طور پر انجام پانے پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ اس کا دفاع مضبوط

رہے، دوسرے یہ کہ اس کا عدالتی نظام ٹھیک طریق سے کام کرتا رہے اور اس کے قوانین نافذ ہوتے رہیں۔ پہلا وظیفہ بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لئے ہے اور دوسرا وظیفہ اندرونی مفاسد کی روک تھام کے لئے۔ لیکن نبی اکرمؐ کی حکومت کو ان دونوں وظائف کی انجام دہی میں یہود و منافقین کی طرف سے شدید مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان مزاحم قوتوں نے کس طرح اسلامی ریاست کے نظام عدل و خلل اندازیاں کیں اور سول نظم و نسق کو کمزور کرنے کے لئے کیا کارستانیاں دکھائیں۔ ایک نوخیز ریاست کے سول نظم و نسق ہی کو اگر قائم نہ ہونے دیا جائے تو وہ نہ تو داخلی مشکلات پر قابو پاسکتی ہے اور نہ خارجی قوتوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اس کا عین وجود بالکل ابتدائی مراحل میں خطرے کی زد پر آجاتا ہے۔

چنانچہ تاریخ میں بیشمار نظائر موجود ہیں کہ فاتحین اور انقلابیوں نے جہاں کہیں بھی کوئی نئی حکومت قائم کی ہے وہاں سول نظم کو

نافذ کرنے میں ابتداءً غیر معمولی جبر وسختی سے کام لیا ہے۔ لیکن محسن انسانیت کی حکومت جس اخلاقی نظریے اور جس تصورِ عدل پر قائم تھی اس میں بیجا سختی کا موقع نہ تھا اس لئے مدینہ کے باشندوں کا ظلم کو کسی قدر کھل کھیلنے کی راہیں مل گئی تھیں۔ مدینہ کی اسلامی ریاست کا وہ دستوری معاہدہ جس کے تحت مسلمان مہاجرین انصار اور یہود کے قبائل ایک سیاسی ہیئت اجتماعیہ میں جمع ہوئے تھے، اس میں تسلیم کر لیا گیا تھا کہ سیاسی اور عدالتی لحاظ سے اختیار اعلیٰ (Final Authority) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے وہ دستاویز آج تک محفوظ ہے اور اس میں حسب ذیل دو واضح دفعات موجود ہیں۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۲۔ ص ۳۳۔۳۴۔۱۴۱ و کتاب الاموال ابو عبیدہ قاسم بن سلام پیرا ۵۱۸، ص ۲۰۲)

...... وانکم مهما اختلفتم فيه من شيء فان مرده الي الله عزوجل والي محمد صلي الله عليه وسلم

......وانہ ما کان بین اہل ھذہ الصحیفۃ من حدث او اشتجار یخاف فسادہ فان مردہ الی اللہ عز وجل والیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس دستوری بیان کے بعد معاہد یہودی قبائل پر شرعی، اخلاقی اورسیاسی اور قانونی حیثیت سے یہ فرض عائد ہو گیا تھا کہ وہ اس نظام عدل وقانون کو کامیاب بنانے میں پوری طرح تعاون کریں اور اس کی وفادارانہ اطاعت کریں جو سرورِ عالم کی سرکردگی میں چل رہا تھا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو ایک غیر منظم معاشرہ کو قانون کی عملداری کے اصول پر باقاعدہ شہری نظم میں لانا محسنِ انسانیت کی ایک عظیم الشان قابلِ قدر خدمت تھی۔ اور جرائم اور بدکاریوں کے استیصال کے لئے انصاف کے فطری اور دائمی اصولوں کی مساویانہ تنفیذ ایک ایسا بابرکت اقدام تھا جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حالت امن وامان یہودیوں کے لئے بھی اتنی ہی نافع تھی جتنی دوسروں کے لئے۔ پھر قانون

الٰہی کے نظام کی اقامت خود ان کے اپنے مشن میں شامل تھی پھر اوپر سے معاہدانہ ذمہ داری انہوں نے بہ رضا و رغبت قبول کی تھی۔

لیکن جہاں انہیں یہ محسوس ہوا کہ اسلامی ریاست کے بے لاگ قانون کی زد ان کے کسی مفاد پر پڑتی ہے اور ان کی کوئی شخصیت اس کی لپیٹ میں آتی ہے تو وہ اپنی معاہدانہ، سیاسی، اخلاقی اور شرعی ذمہ داریوں اور معاشرے اور انسانیت کے مجموعی مفاد کو یکسر نظر انداز کر کے الٹے راستے پر پڑ جاتے رہے۔

یہود کے ایک شادی شدہ مرد نے کسی منکوحہ یہودیہ سے زنا کی۔ معاملہ یہودی سرداروں کے عالم کی خدمت میں دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ ایسی حرکت پر کیا سزا دی جائے گی۔ انہوں نے پیشتر سے رائے قائم کر لی کہ اگر ہماری رواجی سزا (تحمیم) بتائی جائے تو محمدؐ کو ایک بادشاہ سمجھو اور بات

مان لو لیکن اگر کتاب الٰہی کے مطابق رجم کی شرعی حد جاری

کرنے کو کہیں تو پھر وہ (اپنے علم صحیح اور اپنی جرأت حق اور اتباع

فرمان الٰہی کی رو سے) بنی ہیں اور ان سے بچنا کہ تمہارا جو کچھ

قائدانہ اثر باقی ہے وہ بھی نہ جاتا رہے۔ آدمی پہنچا اور پیغام دیا

اور اکابر یہود کی طرف سے پیشکش کی کہ ہم آپ کو حکم بناتے

ہیں۔ یہ پیشکش دستوری معاہدہ سے ٹکرا لی تھی۔ معاہدہ کی رو سے

حضورؐ مستقل طور پر مدینہ کے حکم اور عدلیہ کے سربراہ تھے علی،

غالباً یہی وجہ ہوئی کہ حضورؐ اٹھ کر سیدھے بیت مدراس تشریف

لے گئے اور جا کر یہود سے فرمایا کہ اپنے عالموں کو لاؤ۔ عبداللہ

بن صوریا کو پیش کیا گیا۔ بعض روایتوں کے مطابق اس شخص کے

ساتھ ابو یاسر بن اخطب اور وہب بن یہودا بھی تھے۔ دوران

گفتگو میں سب سے عبداللہ بن صوریا کو علم تورات میں فاضل

ترین مستند شخصیت قرار دیا۔ حضورؐ نے اس عالم سے علیحدگی میں

گفتگو کی اور خدا کا خوف دلا کر اور بنی اسرائیل کے زرین

ہو اب تاریخ کی یاد تازہ کرا کے دریافت کیا کہ کیا تم جانتے

ہو کہ شادی شدہ زانی کے لئے تورات میں رجم کا حکم آیا ہے''؟

اس نے جواب دیا"- اللھم نعم !'' ہاں! بخدا! وحی سے جو

حقیقت حضورؐ پر آشکار تھی - اس کی تصدیق فریق مخالف کی

طرف سے بھی ہو گئی - لیکن مجلس عام میں یہودی سردار اور علماء

کج بحثی کرتے رہے - ان کو اصرار تھا کہ ہمارے قانون شریعت

میں زنا کی سزا تحمیہ ہے - اس اصطلاح کے مفہوم کے مطابق

یہودی زانیوں کا منہ کالا کر کے ان کو گدھے پر سوار کرتے اور بستی

میں گھماتے - تورات کا حکم رجم انہوں نے بالائے طاق رکھ دیا

تھا - ان میں جب زنا کی وبا پھیلی اور اونچے طبقوں تک کے لوگ

اس اخلاقی فساد سے ملوث ہو گئے تو معاشرے نے شریعت کا

ساتھ دینے کے بجائے مجرم کی حمایت کا رخ اختیار کر لیا اور سزا

میں کمی کر دی - اب اکابر یہود کو اندیشہ یہ تھا کہ اگر تورات کے

قانون رجم کا احیاء ہو جاتا ہے تو پھر کس کس بکرے کی ماں کب

تک خبر سنائے گی۔ آج وہ کل ہماری باری ہے یہی وجہ تھی کہ وہ رجم کی سزا کا نفاذ رکوانا چاہتے تھے۔ مجبوراً حضورؐ نے مجلس عام میں ان سے تورات منگوائی۔ (فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صٰدقین) ایک یہودی عالم نے متعلقہ مقام کی قرآت کی۔ اس نسخہ میں آیت رجم موجود تھی۔ اس ستم گر عالم نے آیت پر ہاتھ رکھ کے آگے پیچھے سے پڑھ ڈالا۔ عبداللہ بن سلام (مشہور یہودی عالم جو ایمان لے آئے تھے) نے لپک کر اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور حضورؐ کو دکھایا کہ "اے پیغمبر خدا! ملاحظہ کیجئے یہ رہی آیت رجم" (انجیل یوحنا میں واضح ثبوت موجود ہے کہ محصن زانیہ کے لئے اصل تورات میں رجم ہی کا حکم موجود تھا۔ ملاحظہ ہو۔ یوحنا باب ۔۸، آیت ۔۵ کے یہ الفاظ: "توریت میں ہم نے موسیٰ کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں"۔ تورات کے متداول نسخوں میں یہودی مفسرین اور فقہا اور اہل تحریک کی آمیزشوں کے ساتھ زنا کی بعض صورتوں میں قتل اور سنگساری کی

سزا مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو "اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتا پکڑا جائے تو وہ دونوں مار دیئے جائیں"۔ (استثنا باب ۲۱۔ آیت ۲۲) "اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں (استثناء باب ۲۲۔ آیت ۲۳)۔ حضورؐ نے اس مکاری پر یہود کو سخت ملامت کی اور یہ کہہ کر مجرموں پر حد جاری کر دی کہ "میں پہلا شخص ہوں جو خدا کے حکم اور اس کی کتاب پر عمل پیرا ہونے کے مسلک کی تجدید کرتا ہوں"۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۲۔ ص ۱۹۳۔۱۹۲) مسلم باب رجم الیہود اہل الذمۃ فی الزنا۔ زاد المعاد ج ۳۔ ص ۲۰۷)

یہ تھے وقت کے حاملان دین متین اور حامیان شرع متین جو بغلوں میں قانون الٰہی لئے ہوئے من گھڑت رواجی قانون کا کھوٹا سکہ چلا رہے تھے اور اس کردار کے ساتھ وہ اس

مقدس ہستی کے مقابلے کو نکلے تھے، جو قانون الٰہی کا بے لاگ طریقے سے احیاں کرنے اٹھا تھا اور قرآن کا یہ نغمہ حق فضاؤں میں گونج رہا تھا کہ "لستم علی شیء حتی تقیموا التوراة والانجیل وما انزل الیکم من ربکم" - اس وقت تک تمہاری کوئی بنیاد ہی نہیں ہے جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور اللہ کی طرف سے جو کچھ تو اتین نازل ہوئے ہیں ان کو نافذ نہ کر دکھاؤ جب تک تمہارے عقیدے و عمل میں یہ بھاری تضاد موجود ہے تمہاری کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔ تم ایک بے معنی اور بے وزن ٹولی ہو۔

یہودی معاشرہ کے فساد عام کا ایک بڑا مظہر یہ تھا کہ ان میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کی تقسیم مستقل طور پر قائم ہو چکی تھی اور قانونی مساوات یکسر ختم ہو گئی تھی با اثر لوگوں کے لئے قانون الگ تھا اور کمزوروں کے لئے الگ۔ انصاف کی ندی پھٹ کر الگ الگ دھاروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ان کے قاضی اور مفتی

میزان عدل کے پلڑے نابرابر کر چکے تھے۔ اور دوہرے اور تہرے باٹ استعمال کر رہے تھے۔ چنانچہ بنو نضیر اور بنو قریظہ میں ان کے غلبہ اور ضعف کی وجہ سے نامساویانہ نظام دیت رائج تھا۔ کوئی نضیری کسی قریظی کو قتل کر دیتا تو دیت سو وسق لی جاتی اور صورت جرم الٹی ہوتی تو پچاس وسق دی جاتی۔ حضور کے مدینہ آنے اور اسلامی نظام عدل کے قائم ہو جانے کے بعد بنو نضیر کے کسی آدمی نے بنو قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیا۔ بنو قریظہ نے دگنی دیت دینے سے انکار کیا اور مساوات کا حق منوانے کی کوشش کی۔ اب تو ان کے سامنے ایک سہارا موجود تھا۔ بحث میں تیز ی آتے آتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں قبیلوں میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر دونوں اس پر راضی ہوئے کہ معاملہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لے جایا جائے اور وہاں سے جو فیصلہ ہو اسے قبول کر لیا جائے۔

حضور نے فاحکم بینھم بالقسط کے حکم کے تحت

دیت کے اس غیر مساویانہ نظام کو ختم کر کے ترازو کے پلڑے ہمیشہ کے لئے برابر کر دیئے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲، ص ۶۰ سیرت ابن ہشام، ج ۲۔ ص ۱۹۶) اور ساتھ ہی قرآن نے عدل کے خدائی نظام کو بگاڑنے والوں سے خطاب کر کے انتباہ دیا کہ:

"جو لوگ خدا کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق معاملات کے فیصلے نہیں کرتے وہی کافر ہیں"۔ (مائدہ)

اسلامی نظام انصاف اور اقامت حدود میں اگر تنہا یہود مدینہ ہی رکاوٹ ہوتے تو بھی غنیمت ہوتا مشکل یہ تھی کہ مجموعی طور پر سارے عرب میں انصاف کی دورنگی پائی جاتی تھی۔ بااثر طبقوں کے لئے قانون دوسرا تھا۔ کمزوروں اور عام لوگوں کے لئے دوسرا۔

فتح مکہ کا موقع تھا کہ فاطمہ نامی ایک مخزومی عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ چونکہ وہ بااثر قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔

اس لئے قریش کے لوگ اس کی گرفتاری پر بڑے بے چین ہوئے اور ان کے تصور میں وہ بات نہ سمارہی تھی کہ ایک عورت پر بھی قانون کا وہی حکم عقوبت چل جائے جو عام لوگوں کے لئے ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ رسول خدا سے کہہ کہا کر اسے چھڑا لیا جائے۔ مگر آگے ہو کر بات کون کرے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے اسامہ بن زید کو سفارشی بنایا۔ اسامہ نے جا کر مدعا عرض کیا۔ حضورؐ کے چہرے کا رنگ یہ بات سن کر متغیر ہو گیا اور فرمایا "کیا تم اللہ کی ایک حد کے بارے میں (اسے رکوانے کی) سفارش کرتے ہو"؟ بس اتنے ہی پر اسامہ کو احساس ہو گیا اور انہوں نے معافی طلب کی۔ دن ختم ہونے پر حضورؐ نے مجمع میں خطاب فرمایا کہ:

"تم سے پہلے کے لوگوں کا ایک سبب ہلاکت یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی ممتاز آدمی چوری کرتا تو اس سے چشم پوشی کر لیتے اور جب کوئی کمزور درجے کا آدمی یہی جرم کرتا تو اس پر سزا نافذ

کر دیتے تھیں اپنے بارے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالوں''۔ (مسلم باب النھی عن الشفاعه فی الحدود)

یہی مروجہ ذہنیت ام حارثہ کے معاملے میں بھی سامنے آئی۔ اس عورت نے کسی کا دانت توڑ ڈالا مقدمہ حضورؐ کے سامنے لایا گیا۔ حضورؐ نے قصاص کا حکم سنایا۔ ام ربیع (غالباً مجرمہ کی بہن تھیں۔ لیکن اس معاملہ میں روایات میں کچھ التباس ہو گیا ہے) نے یہ فیصلہ سنا۔ تو حضورؐ سے بہ تعجب پوچھا کہ کیا فلانی سے بھی قصاص لیا جائے گا۔ خدا کی قسم اس سے قصاص نہیں لیا جا سکتا''۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ''ارے ام ربیع! قصاص تو خدائی نوشتہ ہے!'' مگر وہ کہنے لگی کہ ''نہیں! خدا کی قسم، اس سے ہرگز قصاص نہیں لیا جا سکتا''۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس درجہ کی مجرمہ کا دانت کیسے توڑا جا سکتا ہے۔

ادھر عملاً یہ ہوا کہ فریقین کے درمیان دیت پر معاملہ طے ہوگیا۔ اس طرح حکم قصاص (جس میں دیت کی گنجائش بھی شامل تھی) پورا ہوگیا۔ (مسلم باب القصاص من الجراح الا ان یرضوا بالدیۃ)

یہود نے صرف اسلامی عدلیہ ہی کے کام میں رخنہ اندازیاں کرنے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ وہ مجموعی سول نظم ونسق میں جہاں موقع ملتا گڑبڑ پیدا کرنے سے باز نہ آتے۔ اس کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد خیبر کے یہودیوں کی درخواست پر جب ان کو بطور کاشتکار اراضی نصف بٹائی پر رکھ لیا گیا اور اسلامی حکومت کا تحصیلدار ان سے پہلی بار بٹائی لینے پہنچا تو انہوں نے اسے رشوت دینے کی کوشش کی۔ خیانت کے جس خوفناک روگ میں ان کی قوم مبتلا تھی۔ اس کی چھوت انہوں نے نئے نظام کے کارپردازوں کو بھی لگا دینا چاہی۔ یہ تحصیلدار عبداللہ ابن رواحہ تھے۔ رسول خدا کا بھیجا ہوا معتمد علیہ

تحصیلدار یہود خیبر کے اندازوں سے بہت اونچا تھا۔ انہوں نے ان سے صاف صاف کہا کہ "اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے مال حرام کھلانا چاہتے ہو"۔ (سیرت النبی از مولانا شبلی، ج ۲۔ ص ۵۷ بحوالہ فتوح البلدان ص ۳۱)

ان پر اپنا مدعا واضح کردیا کہ مجھے تو کانٹوں سے تول معاملہ کرنا ہے فرمایا:

"رسول اللہ نے مجھے یہاں اس لئے نہیں بھیجا کہ تمہارا مال کھا جاؤں، بلکہ اس لئے بھیجا ہے کہ تمہارے اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم عمل میں لاؤں۔ تم چاہو تو میں اندازہ کرکے نصف تمہیں دے دوں اور اگر چاہو تو تم خود اندازہ کرکے نصف ہمیں دے دو"۔

چنانچہ ابن رواحہ نے ۴۰ ہزار وسق کا اندازہ لگایا اور ۴۰ ہزار وسق مسلمانوں کا حصہ لے لیا۔ اس بے لاگ تقسیم پر جہاں

بعض گھٹیا ذہن کے یہودیوں نے بھنا کر کہا کہ یہ تو ظلم ہے۔ وہاں انصاف پسند عوام نے تسلیم کیا کہ اسی عدل پر آسمان اور زمین قائم ہیں''۔ عبداللہ بن رواحہؓ زندگی بھر اس منصب کو سر انجام دیتے رہے۔ (بخاری باب المزارعۃ وکتاب الشرکت)

غرض کہ ایک نیم منظم معاشرے کو باقاعدہ ایک منظم ریاست بنانے اور خدائی انصاف کے اصولوں کو جاری کرنے میں محسنؐ انسانیت کو تعاون بہم پہنچانے کے بجائے تہذیب اور مذہب کے قدیمی ٹھیکیداروں نے سخت مزاحمتیں کیں اور نظام حق کی جڑوں کو ابتدائی مراحل میں کھوکھلا کرنے کی ناقابل عفو کرشمیں کیں۔

خانۂ نبوت میں چنگاریاں

مدینہ کے مخالفین اسلام نے شرارت کی چنگاریاں حضورؐ کے حرم میں پھینکنے کے ناپاک جتن بھی کیے۔ ان کی نگاہ میں حضورؐ

کے خاندان اور ان کے رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوانے کا یہ
بہت ہی سیدھا اور آسان راستہ تھا۔ تحریک اسلامی کے سربراہ کو
گھریلو جھگڑوں میں پھنسا دینے کی تدبیر اگر کامیاب ہو جاتی تو
اس کے نتائج بڑے ہی مہلک ہوتے۔ مدینہ کی عام عورتیں حضور ؐ
کے گھر آتی جاتی تو تھیں ہی۔ پھر وہ جو کچھ بھی دیکھتی ہوں گی
اسے نسوانی نفسیات کے مطابق بیان کرتی پھرتی ہوں گی۔ اس
طرح اشرار و منافقین کو بخوبی علم رہتا ہوگا کہ حضور ؐ کے گھر میں
کس طرح فقر و فاقہ کا سماں چھایا رہتا ہے۔ حضور ؐ کی ازواج
مطہرات بڑے بڑے گھرانوں کی خواتین تھیں۔ ان کے ذوق
کسی سے کم اونچے نہیں تھے لیکن دوسری طرف معاشی حالات
جیسے تھے اور جن پر حضور ؐ دل سے راضی تھے وہ ان کے سابق ذہنی
معیارات سے بہت ہی فروتر تھے۔ حضور ؐ کے ساتھ ازواج بھی
مسلک صبر پر گامزن تھیں اور ان کو خود یہ شعور تھا کہ عالم نو کا معمار
اعظم جان جوکھوں کے جس عالم سے گزر رہا ہے اس میں عیش و

تمم کی جنتیں آراستہ نہیں کی جا سکتیں۔ مگر انسان پھر انسان ہے
اور انسان ہمیشہ ان خواہشات و جذبات کے درمیان گھرا رہتا
ہے جنہیں اس کی فطرت میں گوندھ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف
ازواج مطہرات ایمان و اخلاق کے لحاظ سے عالی مرتبت ہونے
کے باوجود اور اتحاد و یک جہتی اور مسکینی و حلیمی کا ایک شاندار
معیار دنیا کے سامنے پیش کرنے کے باوجود کبھی نہ کبھی باہمی
رشک کے جذبات سے ہلکا سا اثر لے سکتی تھیں جو ایک گھر کی
رونق بننے والی خواتین کے درمیان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قریش
کی عورتوں میں شوہروں کی وفاداری و طاعت کی جو کڑی
روایات چلی آرہی تھیں ان کے خلاف مدینہ کی عورتیں مردوں
کے مقابلہ میں خاصا زور رکھتی تھیں چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے رعب و
تمکنت والے مرد تک نے مدینہ کے دور میں ایک بار اپنی زوجہ
محترمہ کو ڈانٹا تو انہوں نے آگے سے جواب دیا۔ اس پر حیرت
سے حضرت عمرؓ نے کہا کہ "تم مجھے جواب دیتی ہو؟" اسی موقع پر

ان کو اندازہ ہوا کہ معاشرہ کی ازدواجی زندگی میں مکہ کی روایات پر مدینہ کی فضا ء کا اثر خاصا پڑ چکا ہے۔

یہ نقشۂ احوال اشرار و منافقین کے سامنے تھا اور اسی کے اندر سے انہوں نے شرارت کی راہ نکالی۔ انہوں نے بعض عورتوں کو اس غرض کے لئے آلہ کار بنا کر استعمال کیا کہ حضورؐ کے گھر میں فتنہ کی چنگاری پھینک کر آگ بھڑکائیں۔ ایک ایسی عورت ام جلدح کا نام ہمارے سامنے آتا ہے جس کا پارٹ یہ تھا کہ کانت تحرش بین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم''۔ (سیرت النبی مولانا شبلی، ج ا۔ ص ۵۰٦ بحوالہ اصابہ ابن حجر)۔ یعنی وہ ازواج مطہرات کو بھڑکایا کرتی تھی اسی طرح کی عورتوں کی مدد سے افک کی چنگاری سے شعلے اٹھائے گئے تھے۔

اشرار کی ان دراندازیوں کی وجہ سے پے در پے چند واقعات ایسے ہوئے جو خاصے تشویش ناک ہو سکتے تھے۔ لیکن

خدا کی مدد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار، صحابہؓ خاص کے تعاون اور ازواج کی شرافت کے اثر سے بروقت اصلاح ہوگئی۔

ان میں سے سب سے بڑا واقعہ ازواج کا وہ متحدہ مظاہرہ تھا جس کا مدعا توسیع نفقہ تھا۔ یہی ایلا کا محرک ہوا۔ خدا کا فضل خاص تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے پورے اخلاص کے ساتھ حضورؐ کا پہلو مضبوط کیا اور اپنی صاحب زادیوں کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے انہیں سختی سے ڈانٹا ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چیلنج آگیا کہ:

"اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور اس کی زینت و آرائش مطلوب ہو تو (وہ اس گھر میں نہیں ملے گی) آؤ میں تم کو رخصتی کے جوڑے دے کر بطریق احسن رخصت کردوں اور اگر تم کو خدا، خدا کا رسول اور آخرت کا ٹھکانا

مطلوب ہے تو خدا نے نیکوکار خواتین کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے"۔ (احزاب)

دو راستے ازواج کے سامنے رکھے گئے تھے کہ جسے چاہیں اختیار کریں۔ اب یہ ازواج کی شرافت تھی کہ ان کو فوراً متنبہ ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ جو اپنے اثر و رسوخ اور اپنی غیر معمولی ذہانت و متانت کی وجہ سے اس مظاہرہ کی لیڈر بنی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے بالا خانے سے اتر کر سب سے پہلے انہیں کو اس خدائی فیصلے سے آگاہ کیا اور انہیں نے سب سے پہلے اعلان کیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں۔ ان کے بعد تمام ازواج نے اپنے مطالبہ سے شرح صدر کے ساتھ دست برداری دے دی۔

دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے ایک بڑے گھرانے میں اگر اشرار کی مسلسل رخنہ اندازیوں اور گھٹیا عورتوں کی لگائی بجھائی کے نتیجے میں کسی ایک موقع پر کھچاؤ پیدا ہو گیا ہو تو یہ کوئی

بڑی بات نہیں۔ بلکہ اتنی شرارتوں کے باوجود اس گھر کے سفینے کا

بخیر و خوبی بچ کے نکل جانا اس کے اہل کی مضبوطی، شرافت اور

یک جہتی کا ثبوت ہے۔

اب اندازہ کر لیجئے کہ حضورؐ کے ہر چہار طرف کس طرح

رنگا رنگ شرارتوں کے ڈائنا میٹ بچھائے جا رہے تھے کہاں

کہاں فتیلے رکھے جا رہے تھے۔

قتل کی سازشیں

سچائی جب کسی کی دعوت پر تحریک بن کے اٹھتی ہے تو

اس کی مزاحم طاقتیں مخالفت بیجا میں پڑ کر مسلسل پستی کی طرف

لڑھکتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اصل دعوت کے

مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہار جاتی ہیں اور فتنہ انگیزیوں اور

تشدد کی کارروائیوں کو بھی ناکام دیکھتی ہیں تو پھر ان کا حسد اور

ان کا کمینہ پن ان کے اندر جرائم پیشہ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی سی

گندی ذہنیت ابھار دیتا ہے۔ اس مرحلہ میں آکر وہ داعیٔ حق اور تحریک عدل کے قائد کی جان لینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایسے خنامی اگر قوت و اقتدار رکھتے ہوں تو وہ حریف کو سیاسی جبر کے شکنجے میں کستے ہیں اور قانون کی تلوار کو حرکت میں لاکر اور عدالتی ڈرامہ اسٹیج کر کے خادمان انسانیت کے خون سے ہاتھ رنگتے ہیں قوت و اختیار سے محروم ہوں تو پھر قتل کی سازشی تدبیریں اختیار کرتے ہیں۔ ٹھیک یہی راہ مکہ کے ارباب جہاد نے اختیار کی تھی اور اب اسی ناپاک راستے پر مدینہ کے سکہ بند اللہ والے بھی گامزن ہو نکلے۔

ایک مرتبہ ۴ھ عمرو بن امیہ ضمری نے قبیلہ عامر کے دو آدمی قتل کر دیئے تھے ان کی دیت وصول کرنے کے لئے نیز معاہدانہ ذمہ داریوں کی یاددہانی کے لئے رسول خدا ابونضیر کے ہاں پہنچے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کو ایک گڑھی کے سائے میں بٹھایا۔ پھر وہ لوگ علیحدگی میں مل کر یہ منصوبہ باندھنے

لگے کہ کوئی شخص جا کر اوپر سے پتھر (چکی کا پاٹ) گرا دے اور حضورؐ کی زندگی کا خاتمہ کردے۔ عمرو بن جحاش بن کعب نے یہ مقدس ذمہ داری اپنے سر لی۔ ادھر حضورؐ پر ان کا ارادہ منکشف ہوگیا۔ آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۲۔ص ۱۹۲)

مشہور یہودی سردار کعب بن اشرف جس کا باپ قبیلہ طے سے تھا اور جس کی ماں یہود کے مال دار مقتدار ابو رافع ابن ابی حقیق کی بیٹی تھی۔ اپنے اس دوگونہ تعلق کی وجہ سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان یکساں رسوخ رکھتا تھا۔ ایک طرف وہ مالی قوت رکھتا تھا۔ دوسری طرف اس کی شاعری کی بھی دھاک تھی، اس کے سینے میں اسلام کے خلاف بڑا زہریلا لاوا ابھرا تھا۔ چنانچہ اس نے مدینہ میں کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ان کے وظائف مقرر کردیئے اور اس طرح حضورؐ کے مقابلے کے لئے کرائے کے آدمی تیار کرلئے۔

یعقوبی کی ایک روایت سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ کعب بن اشرف حضورؐ کو دھوکہ سے قتل کرا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک دوسری روایت (فتح الباری) اس کے مؤید ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کعب نے حضورؐ کی دعوت کی اور کچھ آدمیوں کو مامور کر دیا کہ جب حضورؐ آئیں تو ان کو قتل کر دیں۔ یہ روایات اپنی مستقل حیثیت میں بہت زوردار نہ ہوں۔ مگر کعب کے بغض اور اس کی مجموعی سرگرمیوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایسا ہونا بڑی حد تک قرین قیاس ہے۔

جس زمانے میں بنو قریظہ سے حضورؐ نے تجدید معاہدہ کی۔ اس زمانے میں بنو نضیر نے حضورؐ کو پیغام بھجوایا کہ آپ اپنے ساتھ تین آدمی لائیں اور ہم بھی اپنے تین عالم پیش کریں گے۔ آپ اپنی بات اس مجلس میں بیان کریں۔ اگر ہمارے عالموں نے آپؐ کی تصدیق کر دی تو ہم سب بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضورؐ روانہ ہوئے تو راستہ میں آپ کو اطلاع ہو گئی

کہ یہود تلوار باندھے اس ارادے سے آپؐ کے منتظر ہیں کہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ آپ واپس آ گئے۔

فتح خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت زینب بنت الحرث (موجہ سلام بن مشکم) نے ایک بکری کا گوشت بھون کر تیار کیا اور اس میں زہر ملا دیا۔ پھر یہ معلوم کیا کہ حضورؐ کو کون سا حصہ مرغوب ہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ دست کا گوشت خاص طور پر پسند ہے تو اس نے اس میں باقی گوشت سے زیادہ مقدار میں بہت ہی تیز قسم کا مہلک زہر ملا دیا۔ پھر یہ گوشت حضورؐ اور ان کے ساتھیوں کے لئے تحفہ میں بھیجا۔ حضورؐ نے لقمہ منہ میں رکھا (شاید کچھ حصہ نگلا بھی گیا ہو) اور جلدی تھوک دیا۔ فرمایا اس گوشت نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس میں زہر ملا ہے۔ پھر خود بھی نہیں کھایا اور ساتھیوں کو بھی روک دیا۔ بعد میں اس یہودیہ کو بلایا گیا تو اس نے اقرار کر لیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے پیچھے بہت سے یہودیوں کی سازش کام کر رہی تھی۔ حضورؐ نے جب

مجلس عام میں ان کو بلوا کر بات کی تو انہوں نے بھی اعتراف کیا۔ مگر بات یہ گھڑی کہ ہم نے آپ کی جانچ کرنا چاہی تھی کہ آپ اگر سچے نبی ہوں گے تو آپ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ ورنہ ہم کو نجات مل جائے گی۔ (سیرت النبی علامہ شبلی، ج ا،ص ۲۷۶ بحوالہ فتح الباری)

کھانے کی اس مجلس میں جو صحابہ شریک تھے ان میں حضرت براء ابن معرور بھی شامل تھے۔ انہوں نے لقمہ لیا۔ اور زہر کی تلخی محسوس کرنے کے باوجود بتقاضائے ادب حضور کے سامنے اگلنا پسند نہ کیا اور کسی نہ کسی طرح اسے حلق سے اتار لیا۔ اسی ایک لقمہ کے زہر سے ان کا انتقال ہو گیا۔ (زاد المعارج ۲، ص ۴۰۔۳۹ شمائل ترمذی باب ماجاء فی صفة ادام رسول الله صلى الله عليه وسلم حديث ۱۷۱ اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری، ص ۲۲۶)

تبوک سے جب حضورؐ کی واپسی ہوئی اور منافقین کے

دل اس مہم کی کامیابی سے بجھے جا رہے تھے کیونکہ ان چھپے

دشمنوں کے ارمان کچھ اور تھے تو انہوں نے حضورؐ کے قتل کی

ناپاک سازش باندھی۔ اس سازش میں بارہ آدمی شریک

ہوئے۔ یہ عبداللہ بن ابی، سعد بن ابی سرح، ابو فاطر اعرابی،

عامر، ابو عامر راہب، جلاس بن سوید، مجمع بن حارثہ، ملیح تیمی،

حصین بن نمیر، طعیمہ ابن ابیرق، عبداللہ بن عیینہ اور مرہ بن ربیع

تھے۔

سازش کی مجلس میں جلاس نے کہا:

"آج رات ہم محمدؐ کو عقبہ سے گرائے بغیر نہ رہیں گے چاہے محمدؐ

اور ان کے ساتھی ہم سے بہتر ہوں، مگر ہم لوگ بکریاں اور یہ

ہمارے چرواہے بن گئے ہیں۔ ہم گویا بے عقل ہیں اور یہ لوگ

بڑے خردمند ہیں"۔

اسی شخص سے یہ قول بھی منسوب ہے کہ:

"اگر یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے تو پھر ہم لوگ تو گدھوں سے بھی بدتر ہیں"۔ (سیرت ابن ہشام جلد ۲۔ ص ۱۷۲)

عبداللہ نے کہا تھا "آج کی رات جاگو تو پھر ہمیشہ سلامتی سے رہو گے۔ تمہارا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ اس شخص کو آج قتل کر دو"۔

مرہ نے کہا تھا "بس اگر ہم اس ایک شخص کو قتل کر دیں تو سب کو اطمینان ہو جائے گا"۔

ان میں سے حصن بن نمیر کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ اس نے صدقے کے مال پر ڈاکہ ڈالا تھا۔

ان میں سے ابو عامر بظاہر راہب تھا، اور صوفی و درویش بنا پھرتا تھا۔ مگر مسجد ضرار کے فتنہ کا بانی تھا۔ اور غسان اور روم

کے حکمرانوں سے حضورؐ کے خلاف سازباز رکھتا تھا۔ اس کے لباس تقویٰ میں طرح طرح کے شر رقص کر رہے تھے۔

طے پایا کہ حضورؐ جب عقبہ سے گزریں تو ان کو نیچے گرادیا جائے۔ اسی منصوبے کے مطابق یہ بارہ مفسدین حضورؐ کے ساتھ ساتھ لگے رہے۔ حضورؐ جب عقبہ کے قریب پہنچے تو ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بطن وادی کے کشادہ راستے سے ہو کر جانا چاہیں، وہ ادھر سے جا سکتے ہیں۔ آپؐ نے عقبہ کا راستہ لیا۔ صحابہ کی کثیر تعداد بطن وادی کی طرف چلی گئی۔ مگر سازشی گروہ بطور خاص حضورؐ کے ساتھ رہا۔ حضورؐ کی نگاہیں یوں بھی دلوں کی گہرائی میں اتر کر مخفی جذبات کو پڑھ لینے والی تھی اور پھر اپنے سامنے پر پرزے نکالنے والے منافقین کا نبض شناس آپؐ سے بڑھ کر کون ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے غیبی اشارہ دے کر آپؐ کو اس چال سے مطلع بھی کر دیا۔ آپؐ نے دو رفیقوں کو ساتھ لیا۔ ایک حذیفہؓ بن یمان تھے۔ دوسرے عمار بن یاسر۔ حضرت عمار کو حکم

دیا کہ وہ آگے رہیں اور ناقہ کی مہار تھامیں اور حضرت حذیفہؓ سے فرمایا کہ وہ پیچھے پیچھے چلیں۔ جب عقبہ کا خاص مقام آگیا تو سازشی ٹولی بھاگتی ہوئی آئی۔ رات کی تاریکی بھی تھی اور انہوں نے چہروں پر نقابیں بھی ڈال رکھی تھیں۔ حضورؐ کو آہٹ ہوئی تو ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پیچھے لوٹا دیں۔ حضرت حذیفہؓ لپک کر گئے۔ ان لوگوں کا اونٹ دکھائی دیا اور انہوں نے اپنا ترکش اس کی تھوتھنی پر مارا۔ وہ لوگ حضرت حذیفہ کو جب پہچان گئے تو سمجھے کہ راز فاش ہوگیا اور پیچھے بھاگ کر لوگوں میں گھل مل گئے۔

حضرت حذیفہ واپس ہوئے تو حضورؐ نے حکم دیا کہ اس مقام سے اونٹ کو تیز ہنکا کر نکال لے چلو۔ پھر حضرت حذیفہ سے پوچھا کہ کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا۔ انہوں نے کہا کہ فلاں اور فلاں کی سواری تو پہچان لی مگر آدمی نہیں پہچانا۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم نے ان کا عندیہ سمجھا۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر

حضورؐ نے ان کو خود آگاہ کیا کہ یہ لوگ تمہیں عقبہ سے گرا دینا چاہتے تھے۔

صبح ہوئی تو حضورؐ اشارہ غیبی کے مطابق نام بنام ان بارہ سازشیوں کو طلب کیا اور ہر ایک کے دلی جذبات اور مجلس سازش میں کہی ہوئی اس کی باتوں کو اس کے سامنے رکھ دیا اور باری باری ہر ایک سے صفائی طلب کی۔

ان کے جواب بڑے دلچسپ رہے ہوں گے۔ مثلاً حصن بن نمیر کہنے لگا کہ "مجھے یقین نہ تھا کہ آپ کو اس کی خبر ہوگی۔ مگر آج معلوم ہوا کہ واقعی آپؐ خدا کے رسول ہیں۔ اس سے قبل میں سچا مسلمان نہ تھا، اب صدقِ دل سے اسلام لاتا ہوں۔"

سب نے اسی طرح کی مختلف باتیں بنائیں، عذر کئے اور بعض نے معافی چاہی۔ حضورؐ نے سب سے درگزر فرمایا۔

(اصح السیر مولانا عبدالرؤف داناپوری، ص: ۷۵-۳۷۰)

کافی زوردار روایات اس مدعا کی ہیں کہ حضورؐ نے ان اشخاص کے نام حضرت حذیفہ کو رازداری سے بتادیئے تھے اور عام مسلمانوں پر فاش نہیں کئے۔ علاوہ ازیں ان ناموں میں سے بعض کے بارے میں جزوی اختلافات ہیں۔ نیز ان میں دو تین افراد کے بارے میں یہ بحثیں بھی کی گئی ہیں کہ کم سے کم بعد میں ان کے اندر کوئی علامت نفاق نہیں پائی گئی۔

مگر اصل واقعہ اپنی جگہ تاریخی طور پر ثابت ہے اور اسی کا ذکر قرآن نے "وھموا بما لم ینالوا" (اس چیز کا ارادہ باندھا کہ جس تک پہنچ نہ سکے) کہہ کر کیا۔

اس محسن انسانیت کی عالی ظرفی کی کوئی مثال ڈھونڈ کے لاؤ، تاریخ سے جو نوع انسانی کی خدمت کے لئے خون پسینہ ایک کر کے انقلاب برپا کرتا ہے اور چند اشرار عین دوبدو کشمکش

میں اس کے کارنامے کی جڑ کاٹنے کے لئے اس کے قتل کا
منصوبہ بنا کر عملی اقدام بھی کرتے ہیں۔ ان کا راز فاش بھی
ہو جاتا ہے اور وہ اقبال بھی کر لیتے ہیں لیکن وہ نمونہ انسانیت
اتنے بڑے جرم پر بھی عفو سے کام لیتا ہے۔ حضورؐ سے درخواست
کی بھی گئی کہ "آپ ان میں سے ہر ایک کے اہل قبیلہ کو حکم دیں
کہ وہ اپنے اپنے آدمی کا سر آپؐ کے سامنے لا کے پیش
کر دیں۔" جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ "میں پسند نہیں کرتا کہ
عربوں میں یہ چرچا ہو کہ محمدؐ نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر دشمنوں
کا مقابلہ کیا۔ اور پھر جب غلبہ پا لیا تو خود اپنے ساتھیوں کو قتل
کرنے لگا۔" (تفسیر ابن کثیر)۔ حضورؐ کا منشا یہ تھا کہ تحریک
اسلامی کی اصل طاقت اس کی اخلاقی روح ہے۔ اس اخلاقی
روح کے آئینے میں بدگمانی کا ذرا سا بھی بال آ گیا تو پھر اس کی
امتیازی شان برقرار نہ رہ سکے گی۔ اس لئے اپنی جان کے لئے
خطرات بھی انگیز کر لئے اور نوبہ نو فتنوں اور شرارتوں کا مقابلہ کرنا

بھی گوارا کر لیا۔ مگر یہ پسند نہ کیا کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے جبر و قوت کا لٹھ چلائیں اور جہاں کوئی خرابی دیکھیں۔ اسے اقتدار اور قانون کے زور سے بے تحاشا کچل دیں۔ انسانی معاشرہ کا نظام چلاتے ہوئے بے شمار حکمتیں اور مصالح پیش نظر ہوتے ہیں اور اصلاح کی بہت سی تدبیریں مختلف پہلوؤں سے استعمال کرنی ہوتی ہیں۔ اسلامی انقلاب عام دنیوی انقلابوں سے زیادہ کٹھن اس لئے ہے کہ اس کی نازک اخلاقی روح کا تحفظ قدم قدم پر کرنا پڑتا ہے کہ اس آئینہ میں کہیں کسی عمومی غلط فہمی اور کسی مخالفانہ پروپیگنڈے کا غبار نہ آ جائے۔

ان ہی واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ یہودیوں نے آپ پر جادو کا ایک حملہ بھی کیا تھا۔ بہادر دشمن وہ ہوتا ہے جو کھل کر مقابلہ کرے اور اگر وہ جان کے درپے ہو تو چیلنج کر کے کھلم کھلا حملہ آور ہو۔ لیکن یہودیوں میں اتنا بل بوتا نہ تھا۔ چنانچہ وہ سازش کی راہ پر پڑے جو بزدلوں اور کمینہ فطرت لوگوں کی راہ

ہوتی ہے۔ لیکن اس سے آگے جادو اور ٹونوں اور وظیفوں اور جھاڑ پھونکوں کے زور سے وہ لوگ کسی پر حملہ کرتے ہیں جو دوں ہمتی اور سفلگی کے لحاظ سے آخری مرتبے سے بھی فروتر ہو جائیں ۔ سو ان لوگوں نے بغض کے مارے یہ گھٹیا حرکت بھی حضورؐ کے خلاف کر ڈالی۔

بنی رزیق کا ایک شخص لبید بن عاصم یہودیوں کا حلیف تھا اور منافقانہ شخصیت کا حامل۔ اس کے ہاتھوں عمل سحر کرایا گیا۔ ایک یہودی لڑکا اپنی اچھی فطرت کی وجہ سے حضورؐ کی مائل تھا اور آپؐ کی خدمت کیا کرتا تھا، اس کو مجبور کر کے بعض یہودیوں نے حضورؐ کے سر کے بال اور کنگھی کے دندانے حاصل کیے اور ان پر جادو کا عمل کر کے بارہ گرہوں والا گنڈا بنایا گیا اور ذروان نامی کنوئیں میں اسے رکھوایا گیا۔

احادیث میں آتا ہے کہ اس عمل سحر کی وجہ سے حضورؐ

ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتے، کسی کام کا خیال فرماتے کہ وہ کرلیا ہے، حالاں کہ نہ کیا ہوتا۔ جنسی میلان پر بھی کچھ اثرات تھے۔ القائے ربانی سے آپ اس عمل سحر سے آگاہ ہوئے۔ وہ گنڈا نکلوایا گیا اور آپ کی طبیعت معمول پر آگئی۔ (تفسیر ابن کثیر، ج:۴، ص:۵۷۴)

اس واقعہ سے متعلق ایک مشہور بحث یہ چلتی ہے کہ نبی پر سحر کا اثر ہوسکتا ہے یا نہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ قطعاً اثر نہیں ہوسکتا۔ اس دلیل کو لے کر منکرین حدیث نے احادیث کو ناقابل اعتماد ثابت کرنے میں بھی استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ایک نبی کا انسانی جسم جس طرح امراض وضربات اور میوں سے اثر لیتا ہے اسی طرح اسکے نفسیاتی قویٰ بھی ہر طرح کے ظاہر و پنہاں محرکات سے اثر لیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ پر فرعون کے جادوگروں کے عمل کو دیکھ کر ذہنی اثر ہوا۔ اور آپ نے ان رسیوں کو سانپ محسوس کرکے خوف محسوس کیا (فاوجس في

نفسہ خیفۃ موسیٰ) جادو کے جس اثر کی نفی انبیاء کے حق میں کی گئی ہے وہ ایسا اثر ہے جو کارِ نبوت میں قادح ہو سکتے اور ذہن کسی دوسرے کے قبضے میں چلا جائے اور قوت ارادی کی باگ ڈور ہاتھ سے بالکل چھوٹ جائے۔ (تفہیم القرآن، ج ۲، حاشیہ ۱۱۴، ۲۴۹)

اس بحث سے قطع نظر یہ واقعہ مان لینے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے کہ یہود نے اپنی طرف سے حضورؐ پر عمل سحر کرنے کا اقدام کر ڈالا تھا۔ ان کا جرم اپنی جگہ ثابت ہے۔

یہ واقعات جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو اس وقت ہم پر اس تشویش کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو حضورؐ کی جان کے متعلق مدنی دور میں اسلامی جماعت کو لاحق رہتی تھی۔ حضورؐ کو اگر کبھی رات کے وقت گھر سے نکلنا پڑتا تو رفقاء کو سخت اضطراب رہتا۔ طلحہ بن براء نے ان ہی حالات کو مدنظر رکھ کر مرض الموت

میں وصیت کی کہ اگر میرا دم واپسیں رات کو مقدر ہو تو حضورؐ کو اطلاع نہ کی جائے کیونکہ یہود کی طرف سے خطرہ ہے۔ خدا نخواستہ دشمنوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچے۔ اگر حضورؐ اتفاقاً نگاہوں سے ذرا بھی اوجھل ہو جاتے تو رفقاء میں گھبراہٹ پھیل جاتی اور وہ تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ مشہور اور معرکتہ الآرا روایت جس میں شہادت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کو داخلہ جنت کی ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ اپنے اندر ان حالات کی ایک جھلک رکھتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ:

"ہم لوگ رسول اللہؐ کے گرد بیٹھے تھے اور ہماری اس مجلس میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شریک تھے۔ رسول خدا ہمارے درمیان سے اٹھ کر کہیں چلے گئے اور خاصی دیر لگا دی۔ ہمیں تشویش لاحق ہوئی کہ ہمارے ساتھ موجود نہ ہونے کی صورت

میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچادیا جائے ہم لوگ اس خیال سے گھبرا سے گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے جس پر سب سے پہلے گھبراہٹ طاری ہوئی۔ وہ میں ہی تھا۔ سو میں حضورؐ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا"۔ (مشکوٰۃ جلد اول۔ کتاب الایمان، فصل سوم)۔

کھوج لگاتے لگاتے حضرت ابو ہریرہؓ بنونجار کے ایک انصاری کے باغ تک جا پہنچے احاطے کی دیوار کے گرد گھوم پھر کر دیکھا کہ کدھر کوئی دروازہ ہے لیکن احاطہ لمبا ہوگا اور گھبراہٹ اور جلدی میں ان کو کوئی نمدگی راستہ نہ ملا۔ آخر انہوں نے دیکھا کہ پانی کی ایک نالی احاطہ کی دیوار کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سمٹ سمٹا کر وہ ان کے اپنے الفاظ میں کہ میں لومڑی کی طرح سمٹ کر نکلا نالی کی راہ سے اندر پہنچے۔ حضور کو وہاں دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی...... اس کے بعد وہ گفتگو ہوئی جس میں حضورؐ نے مشہور بشارت دی۔

ایک صحابیؓ خاص کے اس بیان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا

ہے کہ یہود و منافقین کی نت نئی قاتلانہ سازشوں کے باعث

مدینہ کی فضا کیسی رہتی تھی اور حضورؐ کی زندگی کن خطروں میں

گھری رہتی تھی۔ مگر وہاں اعتماد علی اللہ کا حال یہ تھا کہ ایک بار ان

ہی خطرات و خدشات کے پیش نظر صحابہ کرام نے حفاظتی پہرے

کا انتظام کیا۔ مگر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے مطابق

کہ واللہ یعصمک من الناس (اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ

رکھے گا) اسی وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر فرمایا:

"لوگو! واپس چلے جاؤ، میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا

ہے"۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲۔ ص ۷۸)

یہ وہی ایمان تھا جو حضورؐ کے خلاف ارادہ قتل کر کے

گرفتار ہو جانے والے ایک مجرم کے سامنے بھی ظاہر ہوا۔ جب

کہ آپ نے فرمایا کہ:

"اسے چھوڑ دو! کیوں کہ یہ مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا

تھا''۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲، ص ۹۷)

ذرا انسانیت کے اس معمار کے مقام کا تصور کیجئے کہ جس کے گرد قتل کی سازشیں عشق پیچاں کی بیلوں کی طرح نشوونما پاتی تھیں اور فتنے تیندوے کے کناروں کی طرح پھیلے تھے۔ مدینہ میں کچھ لکڑے بیٹھے تھے اور دن رات وہ شجاعت کے شیر کا شکار کرنے کے لئے جال تنتے رہتے تھے۔

ادھر مکہ کا کوہ آتش فشاں بھی روز بروز زیادہ کھولتا جا رہا تھا اور اس کے سینے میں بھی عناد اور کمینگی کا لاوا ابھار زور کر رہا تھا۔ ہجرت سے پہلے حضورؐ کے قتل کو جو بہت بڑی اجتماعی سازش کی گئی تھی۔ اگرچہ اس نے اب باقاعدہ جنگی مہمات کی شکل اختیار کرلی تھی۔ مگر ان کھلی کھلی مہمات کی ناکامیاں قتل کی خفیہ سازشوں کی محرک بھی بن رہی تھیں۔

معرکۂ بدر میں حضورؐ کی مٹھی بھر جماعت نے مظلومانہ

صبر کے نیام سے حق کی تیغ برق دم نکال کر جب اپنے ہاتھ دکھائے تھے تو فرزندان جاہلیت کو وہ چرکے لگے جن کی ٹیسوں نے انہیں برسوں آتش زیر پا رکھا۔ کوئی گھرانا نہ تھا جس کے اچھے اچھے جوان اور سردار کھیت نہ رہے ہوں لیکن گنتی کے چند بے سروسامان انقلابی مسلمانوں کے ہاتھوں سے مار کھا کر اب اف کی صدا نکالنا بھی مزید رسوائی کا سبب تھا۔ اس لئے قریش نے منادی کروا دی کہ کوئی شخص مقتولین بدر کا ماتم نہ کرے۔ اس لڑائی میں اسود کے تین بیٹے مارے گئے تھے اور اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا مگر منہ سے بھاپ نہیں نکال سکتا تھا۔ ایک دن اسے رونے کی آواز سنائی دی۔ خادم سے کہا ذرا دیکھنا۔ کیا رونے کی اجازت ہو گئی ہے۔ خادم نے دریافت کر کے بتایا کہ ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے۔ وہ اس کے لئے رو رہی ہے۔ اسود کے جذبے کو اس اطلاع نے مہمیز کیا اور بے اختیار اس نے چند اشعار الاپے جو خاص ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں ان میں سے

تین ماتمی ہوں:

أتبكي أن يضل لها بعير ... ويمنعها من النوم السهود

فلا تبكي على بكر ولكن ... على بدر تقاصرت الجدود

وبكي إن بكيت على عقيل ... وبكي حارثاً أسد الأسود

وہ ایک اونٹ کے کھو جانے پر روتی ہے اور اس کی نیند نہیں آتی، اونٹ کے لئے نہ رو، رونا ہے تو بدر کے حادثے پر رو۔ جہاں نصیبہ کوتاہ ہو گیا۔ روتی ہے تو پھر عقیل کے لئے رو اور اس حارث کے لئے رو جو شیروں میں ایک شیر تھا۔

مکہ کے ایسے غم آگیں ماحول میں عمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ یکجا بیٹھے مقتولین پر رو رہے تھے۔ صفوان نے کہا "اب جینے میں لطف نہیں رہا" عمیر کہنے لگا۔ اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا۔ اور محمدؐ (صلعم) کو قتل کر آتا۔ میرا بیٹا بھی وہاں قید میں پڑا ہے۔

"صفوان نے اس کے بچوں اور قرض کی ذمہ داری لی۔ اور عمیر نے فوراً گھر آکر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچا تو حضرت عمرؓ نے اس کے تیغی جذبے کو اس کی پیشانی سے پڑھ لیا اور گلے سے پکڑے پکڑے حضورؐ کے سامنے لائے۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ قریب بلایا۔ پوچھا کس ارادے سے واپس آئے ہو۔ عمیر نے کہا بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ پوچھا یہ تلوار کیوں لٹکا رکھی ہے۔ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کیا کام دے سکیں"؟

حضورؐ نے اب اس کے سینے کا راز نہاں کھول کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ فرمایا "تم نے اور صفوان نے حجرے میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش کی ہے لیکن اللہ تمہارے اور تمہارے اس ارادے کے بیچ میں حائل ہے"۔

عمیر نے یہ سنا تو مبہوت ہوگیا۔ بولا۔ "محمدؐ! آپ

سچے پیغمبر ہیں۔ میرے اور صفوان کے علاوہ اس معاملہ کی اور کسی کو خبر نہ تھی"۔

عمیر مسلمان ہو کر مکہ واپس پہنچا۔ اور جرأت کے ساتھ اسلام کی دعوت دی اور بہت بڑی تعداد کو اسلامی انقلاب کے جھنڈے تلے لے آیا۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۲۔ ص ۳۰۶۔۹)

فتح مکہ کے موقع پر فضالہ بن عمیر کے سینے میں بھی انتقام کی بجلی کوندی۔ دل ہی دل میں حضورؐ کے قتل کا ارادہ باندھا۔ حضورؐ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ فضالہ نمودار ہوا۔ قریب آیا تو آپؐ نے بلایا "فضالہ! تم ہو؟" اس نے جواب دیا "ہاں! یا رسول اللہ، فضالہ!" فرمایا "کیا بات تم نے اپنے دل میں ٹھان رکھی ہے"؟ فضالہ نے گھبرا کر جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔ میں تو خدا کا ذکر کر رہا ہوں"۔

حضورؐ یہ جواب سن کرہنس پڑے اور نصیحت کی کہ "خدا سے مغفرت طلب کرو"۔ اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ فضالہ کے سینے پر رکھ دیا اور اس کا دل ٹھکانے آگیا۔ فضالہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے جب اپنا ہاتھ میرے سینے سے ہٹا لیا تو خدا کی مخلوق میں سے میرے لئے حضورؐ سے بڑھ کر اور کچھ محبوب نہ رہا"۔

فضالہ اس قلبی انقلاب سے گزر کر گھر چلے گئے۔

(سیرت ابن ہشام، ج ۴۔ ص ۳۷)

فاتح مکہ..... بلکہ فاتح عرب کے خلاف ایک شخص قتل کا ارادہ باندھ کر آتا ہے اور اس کی بارگاہ سے نئی زندگی لے کر روانہ ہوتا ہے۔ کاری زخم لگانے آتا ہے اور اپنے زخموں کا مرہم لے کر جاتا ہے۔

قریش اور یہود اور منافقین سب کے سب اپنی چالیں چلتے رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور آخر دم تک

اپنے بندے اور اپنے رسول کی حفاظت فرمائی۔

ان سازشوں کا اصل مقصود مجرد ایک فرد کا قتل نہیں تھا بلکہ یہ لوگ اسلامی تحریک کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ یہ سچائی کی صبح درخشاں کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔ جس کے دامن نور کے پیچھے تاریکیوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھا۔ یہ اس نظام نو کا گلا کاٹنا چاہتے تھے جس نے صدیوں سے زخم خوردہ مظلوم طبقوں کو پہلی مرتبہ زندگی، آزادی، مساوات اور عزت و آبرو سے مالا مال کیا تھا۔

ہلاکت انگیز غداریاں

اوپر ہم نے مدینہ کی اسلام دشمن طاقتوں کی جن شرارتوں کا ذکر کیا ہے وہ اخلاقی اور قانونی لحاظ سے سنگین جرائم کی تعریف میں آتی ہیں اور اگر ان پر سخت ترین کارروائی کی جاتی تو وہ دین و سیاست کے بہترین اصول عدل کے عین مطابق

ہوتی۔ مگر حضور پاک نے بڑا ہی ٹھنڈا اور صابرانہ رویہ اختیار کیا۔ جس تحریک کے سامنے اصل مقصود انسانیت کی اخلاقی اصلاح و تعمیر ہو وہ اقتدار کی تلوار اور قانون کے ڈنڈے پر انحصار نہیں کر سکتی۔ لوگ کتنی بھی پستی دکھائیں، وہ انسانی فطرت سے مایوسی کو اپنا نقطہ آغاز نہیں بناتی بلکہ بھی امیدیں باندھ کر قدم بڑھاتی ہے اس کی اصل قوت تعلیم و تفہیم ہوتی ہے نہ کہ تعزیر و تہدید۔ اقتدار اور قانون کی طاقت سے ایک مناسب حد تک کام لئے بغیر تو کوئی نظام ریاست وجود ہی قائم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن انسانوں کے ذہن و کردار کی تبدیلی کا کام تلواروں اور کوڑوں سے کبھی نہیں ہوتا۔ عقلی دلیل اور اخلاقی اپیل سے ہوتا ہے۔ اس راہ میں غصہ کے بجائے تحمل اور انتقام کے بجائے صبر زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ انسانیت کے محسن اعظم نے تاریخ کی فضاؤں کو حسن اخلاق سے روشن کرنا چاہا۔ اور مخالفوں کی زیادتیوں اور فتنہ سازیوں پر مردانگی درجے کا صبر دکھایا اتنے

بڑے عفو اور اتنی بڑی چشم پوشی کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ کچھ
لوگ حضورؐ کی برسوں کی کمائی کو فتنوں کے جھگڑوں میں اڑا دینا
چاہتے ہیں۔ نظم و قانون کو معطل کرنے کے سامان کرتے ہیں۔
قتل کی سازشیں گانٹھتے ہیں۔ ذلیل طریقوں سے پریشان
کرتے ہیں اور دنیا بھر میں اپنے نمونے کی پہلی نوخیز ریاست کا
سربراہ شر و فساد کے ان طوفانوں کے نرغے میں سے بڑے وقار
اور سکون کے ساتھ...... بلکہ موجوں اور نہنگوں کو ایک خندۂ استہزا
سے داد دیتا ہوا...... چھوٹی سی ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو نکال لئے
جا رہا ہے۔

لیکن مخالف طاقتوں نے بھی جرم و شرارت کی آخری حد
کو چھوئے بغیر دم نہ لیا انہوں نے ایک بار نہیں بار بار باغیانہ
غداری (High Treason) کے کھلے کھلے اقدامات کئے اور
کوئی لحاظ اس بات کا نہیں کیا کہ وہ ایک دستوری معاہدہ کا قلادہ
اپنے گلے میں ڈال کر جس ریاست کے شہری بنے ہیں اس کی

وفاداری ان پر دین و سیاست دونوں کے تقاضے سے واجب ہو چکی ہے۔ غداری کے یہ کھلے کھلے اقدامات ایسے ہیں جن کی سزا، نہ آج سے پہلے اور نہ آج کہ جمہوریت کے بلند و بانگ دعاوی سے فضائیں گونج رہی ہیں سلب شہریت اور موت سے کم رکھی گئی ہے۔ مگر وہ جو تمدن کی تقدیر بدلنے آیا تھا اس نے اتنے بڑے اور مہلک جرائم کے مقابلے میں بھی حد درجہ کا تحمل دکھایا اور آخر دم تک یہ کوشش جاری رکھی کہ دشمن طاقت کی حس شرافت بیدار ہو، اس کی سوچنے کی طاقتیں جاگ اٹھیں، وہ معقولیت کی طرف مڑ جائے، اور ایک بار، دوسری بار، تیسری بار سنبھل جائے مگر جو لوگ ٹیڑھے راستے پر پڑ گئے تھے۔ ان کی آنکھیں نامرادی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے پہلے نہیں کھل سکیں......

الا ماشاء اللہ۔

ہلاکت انگیز غدارانہ اقدامات کی چند نمایاں مثالیں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ سچائی اور

نیکی کا نظام قائم کرنے والوں کو کن خارزاروں سے گزرنا پڑتا ہے۔

یہ بات روشن ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کی مجلس میں صدق واخلاص کے جن پیکروں نے رسولِ برحق کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا، اس شعور کے ساتھ دیا تھا کہ حضورؐ کے مدینہ جانے اور وہاں تحریک اسلامی کا مرکز بننے کے معنی جنگ ہیں۔ یہ واقعہ قریش کے لئے بہت سے وجوہ سے بڑا بھاری چیلنج ہوگا۔ اور وہ تحت جذباتی اشتعال میں آکر تلواریں سونت لیں گے۔ اس بناء پر حقیقت بھی واضح تھا کہ حضورؐ کی جان، آپ کی قائم کردہ جماعت کا وجود اور دوسرے مرکز تحریک کا تحفظ تائید ایزدی کے تحت تمام تر اب اہل مدینہ کے تعاون پر منحصر تھا۔ اسی مقصد سے انصار کے نمائندہ اور فعّال نوجوانوں سے حضورؐ نے بیعت لی۔ اور اسی غرض کے لئے یہودی قبائل سے پہلے ہی سال ہجرت میں معاہدات استوار کر لئے۔ انصار نے تو اپنی بیعت کا بہ حیثیت مجموعی آخر دم

تک حق ادا کیا۔ مگر خدا کی کتاب کے امانت داروں اور انبیاء کے وارثوں نے اوران کے عقید تمندوں نے اپنے باندھے ہوئے معاہدوں کو بار بار خود ہی پامال کیا۔

سب سے پہلا اور نمایاں واقعہ غداری یہ ہے کہ قریش مکہ نے عبداللہ بن ابی کو کارآمد ترین آدمی پا کر اسے ایک خفیہ خط کے ذریعے مدینہ کے فاسد وار کمزور عناصر کو اپنے اثر میں لینے کے لئے ایک تہدیدی پیغام بھیجا۔ لکھا کہ:

"تم لوگوں نے ہمارے آدمی (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم اسے مار ڈالو یا مدینہ سے نکال کر باہر کرو۔ ورنہ ہم سب مل کر تمہارے خلاف چڑھائی کریں گے اور تم کو قتل کریں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے لئے سامان عشرت بنائیں گے"۔ (سنن ابوداؤد باب خبر النضیر)۔

عبداللہ بن ابی اگر ایمان دار اور شریف شہری ہوتا تو وہ
فوراً اس خط کو حضورؐ تک پہنچاتا اور اس کی دلی خواہش یہ ہوتی کہ
قریش کی دھمکی کے مقابلے میں سارے مدینہ کے جذبات
حمیت کو صف آرا کر دیا جائے۔ لیکن غداری تو اس کی روح میں
رچی بسی تھی۔ وہ اپنی محرومی اقتدار کا انتقام لینے کے لئے اس
پر تل گیا کہ قریش کا منشا پورا کر دیا جائے۔ اس اندازہ تھا کہ
تحریک اسلامی کے مقابلے میں مدینہ کے باسیوں میں
شرپسندوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن یہ راز بہت جلد
کھل گیا اور حضورؐ مطلع ہو گئے۔ خود عبداللہ بن ابی کے پاس
تشریف لے گئے اور اسے سمجھایا کہ تم لوگوں کے اپنے ہی بیٹے
بھتیجے اور بھانجے اپنی پوری قوت شباب کے ساتھ دین حق کی
علمبرداری کر رہے ہیں اور اگر کوئی ایسی ویسی صورت پیدا ہو گئی تو
تم دیکھو گے کہ تمہاری ہی اولادیں تمہارے مقابلے میں کھڑی
ہیں۔ تمہیں اپنے ہی بچوں سے لڑنا ہوگا۔ عبداللہ بن ابی کی سمجھ

میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ اپنے منصوبے سے باز آ گیا۔ واضح رہے کہ جنگ بدر کے بعد قریش نے پھر ایسا ہی ایک خط عبداللہ کو بھیجا تھا۔

اسی فتنہ گر نے ایک نہایت ہی نازک موقع پر سخت غدارانہ اقدام یہ کیا کہ جب بنو نضیر کی بار بار عہد شکنی اور تخریبی حرکات پر اسلامی ریاست کی طرف سے ان کی دس روز کے اندر اندر مدینہ کی حدود سے نکل جانے کا حکم ہوا اور وہ اس کے لئے تیاریاں بھی کرنے لگے تو عبداللہ بن ابی نے ان کو کہلا بھیجا کہ خبردار! اس حکم کی تعمیل نہ کرنا اور اپنی بستی کو نہ چھوڑنا۔ ہم دو ہزار آدمیوں کی کمک لے کر آ رہے ہیں۔ پھر یہ امید بھی دلائی کہ ایک طرف بنو قریظہ تمہاری مدد کریں گے اور دوسری طرف بنو غطفان تمہارے حلیف ہیں۔ چنانچہ بنو نضیر نے حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ آپ کا جو جی چاہے کریں۔ بالآخر اسلامی حکومت کو اپنا حکم منوانے کے لئے فوجی کارروائی

کرنی پڑی۔ (اصح السیر از مولانا عبدالرؤف دانا پوری، ص ۱۱۷)

پھر اسی شخص نے جنگ احد کے انتہائی نازک اور فیصلہ کن موقع پر یہ گل کھلایا کہ جب اسلامی فوج مدینہ سے نکل کر شوط کے مقام پر پہنچی تو یہ تین سو منافقین کو لے کر مدینہ لٹ گیا۔ یہ حرکت اسلامی فوج کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھی۔ کہتا تھا کہ جب ہماری رائے پر عمل نہیں کیا جاتا اور اختیارات دوسروں کے ہاتھوں میں ہیں تو ہم اپنی گردنیں کیوں کٹوائیں۔ دراصل عبداللہ بن ابی کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نہ نکلا جائے۔ (اصح السیر از مولانا عبدالرؤف دانا پوری، ص ۱۲۶، سیرت النبی، ج ۱، شبلی نعمانی، ص ۳۲۳)

غدارانہ سازباز کے لحاظ سے دوسری نمایاں شخصیت ابو عامر کی تھی۔ ہم مسجد ضرار کے سلسلے میں اس کا تعارف کرا چکے

ہیں۔ اس فتنہ گر نے معرکہ بدر کے بعد نبی اکرمؐ کی فتح سے جل
بھن کر مکہ کا سفر کیا اور ابو سفیان سے مل کر قریشی سرداروں کو
انتقام کے لئے بھڑکایا۔ جنگ احد کی آگ کو دہکانے میں اس کا
بھی حصہ تھا۔ یہ خود بھی قریشی لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں اس
زعم کے ساتھ اترا کہ میرے کہنے پر قبیلہ اوس کے لوگ اسلام کا
ساتھ چھوڑ کر قریش کی طرف آجائیں گے۔ اس میدان جنگ
میں اوس والوں کو پکارا۔ مگر اس کو وہ جواب ملا کہ دماغ درست
ہو گیا۔ اور تو اور خود اس کے فرزند حضرت حنظلہؓ نہایت اخلاص
اور جان نثاری سے سرور عالم کے اشاروں پر سربکف کھڑے
تھے۔ پھر احد کے بعد یہ ہرقل روم کے پاس پہنچا تا کہ وہاں سے
فوجیں چڑھا لائے۔ ادھر منافقین کو درپردہ بھروسہ دلایا گیا تھا
کہ تم تیار رہنا، میں کمک لے کر آرہا ہوں۔ اس شخص کا ایک
کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے مقام حنین کے قریب حضورؐ کو اذیت
دینے کے لئے گڑھے کھدوائے تھے۔ چنانچہ آپ ایک گڑھے

میں گر رے اور متعدد چوٹیں آ گئیں۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۲ ۔ ص ۳۸۷۔۸)

غدارانہ سرگرمیوں کا تیسرا بڑا امام کعب بن اشرف تھا۔ اور اس کا تذکرہ بھی اوپر ہم کر چکے ہیں۔ اس شخص نے ایک طرف مدینہ میں وظیفے جاری کر کر کے کرائے کے پٹھو پیدا کر رکھے تھے اور دوسری طرف یہ مکہ والوں کو مدینہ پہ چڑھائی کے لئے بھڑکاتا تھا اس مقصد کے لئے اس نے اپنے اثر و رسوخ، اپنے فن شعر اور اپنی دولت کو خوب استعمال کیا۔ اس کی تحریک سے ابو سفیان اور دوسرے لوگوں نے غلاف کعبہ کو تھام کر بدر کا انتقام لینے کا حلف لیا۔

اس سازشی ماحول نے اسلامی جماعت کو خاص حفاظتی انتظامات اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حضورؐ راتوں کو جاگا کرتے تھے اور اپنے رفقاء کو باری باری پہرے پر مامور کرتے۔ اسی دور

کا واقعہ ہے کہ ایک بار آپؐ نے مجلس عام میں فرمایا "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دے"۔ یہ اشارہ سن کر سعد بن ابی وقاص نے ہتھیار لگائے لگائے سویا کرتے تھے۔ اور غالباً یہی وہ دور ہے جس سے حضورؐ کا یہ ارشاد تعلق رکھتا ہے کہ:

رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا۔

(ریاض الصالحین کتاب الجہاد)

خدا کی راہ میں ایک دن پہرہ دینا دنیا ومافیہا کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

اور یہ کہ:

رباط یوم ولیلۃ خیر من صیام شھر وقیامہ...... الخ۔

(ایضاً)

(خدا کی راہ میں) ایک دن رات کا پہرہ دینا مہینے بھر کے (نفلی) روزوں وشبانہ قیام نماز سے افضل ہے۔

اس خدمت کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ اس کا اجر قیامت تک بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ عذاب قبر سے نجات کا ذریعہ ہے۔ (ایضاً)

علاوہ ازیں ان سازشوں کے زیر اثر اچانک حملے کے اندیشے سے حضورؐ نے اپنے علاقے کی آخری حدوں تک (جس میں بتدریج توسیع ہوتی گئی) طلایہ گردی کا انتظام فرمادیا تھا۔ تاکہ دشمن کو معلوم رہے کہ اسلامی ریاست سوئی ہوئی نہیں بلکہ چاق و چوبند ہے۔

مدینہ کے "پانچویں کالم" کے لئے تحریک اسلامی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا بہترین موقع معرکہ ہائے جہاد کے دور میں پیدا ہوتا تھا یوں تو مدینہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس برس کا جو زمانہ گزارا ہے اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ نازک اور ہنگامی صورت حالات (State of Emergency) چھائی

رہی لیکن حق و باطل کی باہم آویزش جب جب بھی (تھوڑے تھوڑے وقفوں پہ بار بار ایسا ہوتا رہا) معروف معنوں میں جنگ کی صورت اختیار کرتی، یہود و منافقین غدارانہ حرکتوں میں لگ جاتے۔ اسلامی ریاست کے پاسبانوں کے لئے کیسی سنگین صورت حالات ہوتی ہوگی جب کہ ایک طرف شدید معاشی مشکلات اور دوسری طرف معرکہ ہائے پیکار ان کو اپنے گھیرے میں لئے ہوں اور تیسری طرف اپنے اندر کے مارہائے آستین ڈنک مار رہے ہوں۔

احد کا واقعہ ہم اوپر بیان کر ہی آئے ہیں کہ اسلامی فوج میدان جنگ کی طرف مارچ کر رہی ہے اور راستے میں سازشوں کا لیڈر عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو الگ کر کے واپس لے جاتا ہے۔ اگر حضورؐ اور آپ کے جاں نثاروں کی جگہ کوئی دنیاوی طاقت اس صورتحال سے دوچار ہوتی کہ تین ہزار دشمنوں کے مقابلے پہ جانے والی کل ایک ہزار کے لگ بھگ تو سپاہ ہو اور

اس میں سے تین سو آدمی یکایک الگ ہو جائیں اور بقیہ سات سو میں بھی کچھ افراد شر انگیزی کے لئے کھلے ملے رہ جائیں تو شاید وہیں دل ٹوٹ جاتے صحابہ کے ہمت بندھانے سے رک گئے۔ مگر خدا پر ایمان، روح وصداقت کی برتری کا یقین، اخلاقی قوت کی کامیابی کا تصور اور غیبی امداد پر بھروسہ علمبرداران اسلامی کا اصل سرمایہ تھا ان کی قوتوں میں ذرا بھی اضمحلال پیدا نہ ہوا، اور وہ اسی عزم کے ساتھ میدان احد کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ پھر جب میدان احد میں جب سخت وقت آیا، اور نبی اکرمؐ کی شہادت کی خبر اڑی تو منافقین نے اس تجویز کے لئے حامی پیدا کرنے چاہے کہ عبداللہ بن ابی کی منت سماجت کر کے اسے آمادہ کیا جائے کہ وہ ابو سفیان سے امان لے دے۔ پھر اس موقع پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی کمزوریوں پر گرفت کرنے کے لئے ایک طرح کی جو ہزیمت دی تھی۔ اس پر ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمدؐ اگر نبی ہوتے تو کیوں ہزیمت

کھاتے۔ یہ تو دنیاوی حکمرانوں کا سا معاملہ ہوا کہ کبھی جیت ہوگئی کبھی ہار۔ (تفہیم القرآن، سید ابو الاعلیٰ مودودی، ج ا۔ سورۃ آل عمران کے تفسیری نوٹ بہ سلسلہ غزوہ احد) اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر شبہات پیدا ہوگئی گئے۔ بعض لوگ اس طرح سوچنے لگے کہ ہم جب خدا کی راہ میں لڑنے گئے تھے اور خدا کے پیغمبر کی قیادت میں تھے تو پھر آخر ہمیں زک کیوں ہوئی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن نے کہا کہ "ھومن عبد انفسکم" (یہ مصیبت، تمہاری اپنی ہی لائی ہوئی ہے یعنی تمہاری بعض کمزوریاں رنگ لائی ہیں)

اور پھر کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی جس کے پہلے، جس کے بیچ میں اور جس کے خاتمے پر ان چھپے دشمنوں نے غداری کے جوہر نہ دکھائے ہوں جہاں عملاً کارنامہ کوئی انجام نہ دیا جا سکا وہاں سے زبان کے نشتر چلا چلا کر تحریک اسلامی کی رگیں کاٹنے اور مدینہ کی ریاست کا جگر چھیدنے کی کوشش ضرور کی گئی۔

لوگوں کی ہمتیں پست کرنا۔ ان کو ڈرا دے دینا۔ حضور سے قریب کرنے کی پٹی پڑھانا۔ اتفاق سے روکنا۔ اسلامی فوج کا مذاق اڑانا۔ نبی اکرمؐ کی قیادت پر حرف گیری کرنا۔ غرض کہ کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہنے دی۔

البتہ اس پانچویں کالم نے سب سے بڑھ کر اپنے جوہر جنگ احزاب (غزوہ خندق) کے موقع پر دکھائے میدان بدر کے اولین معرکہ میں قریش کی قوت کا کاری ضرب لگ چکی تھی۔ اس کا انتقام لینے کے لئے انہوں نے بڑی تیاریوں سے فوج کشی کی اور احد میں مقابلہ ہوا۔ لیکن وہ پوری طرح بازی سر کئے بغیر ہی پلٹنے پر مجبور ہوگئے۔ ۵ھ میں وہ اپنی اور اپنے سارے حامیوں اور مدینہ کے سازشیوں کی قوتیں مجتمع کر کے اور مختلف قبائل کو اکٹھا کر لائے۔ گویا ہر طرف سے لشکروں (احزاب) نے آکر مسلمانوں کو گھیر لیا۔ یہ بڑا ہی فیصلہ کن معرکہ تھا اور اس کے بعد قریش اور دوسرے دشمنان اسلام کا زور ٹوٹ

گیا اور مسلمانوں نے مدافعانہ پالیسی کو ترک کر کے دشمنوں کی سرکوبی کے لئے پیش قدمی کی پالیسی اختیار کی۔ جنگ احزاب کے خاتمے کے دن ہی درحقیقت فتح مکہ کا دروازہ کھل گیا تھا۔

اس فیصلہ کن معرکہ کے پس منظر میں جن عناصر نے سازشی سرگرمی دکھائی ان میں سرفہرست بنونضیر کے یہودیوں کو رکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ خیبر میں جا کر بسے، انہوں نے حالات کے اتار چڑھاؤ پر برابر نگاہ رکھی۔ جب انہیں جنگ احد کا حال معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو بڑی سخت صورت حالات پیش آئی اور قریش اگرچہ کامل فتح کا سہرا نہ باندھ سکے لیکن خاصا زور دکھا کے آئے ہیں تو انہوں نے متحرک ہو کر تاریخ کے مدوجزر کو تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنونضیر میں سے سلام بن ابی الحقیق، سلام بن مشکم، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع جیسے نامی گرامی سردار نکلے اور انہوں نے بنو وائل میں سے ہوذہ بن قیس، ابو عمارہ اور بعض دوسروں کو ساتھ لیا۔ مکہ جا کر انہوں نے قریش کو

مدینہ پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دلائی اور اپنی حمایت کی پیشکش کی۔ پھر یہ لوگ بنو غطفان کے ہاں پہنچے اور ان کو بھی تیار کیا۔ پھر دوسرے متفرق قبائل میں گھومے قریش نے بھی قبائل میں اپنے پورے اثر کو استعمال کیا چنانچہ دس ہزار سپاہیوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ (اصح السیر۔ از مولانا عبدالرؤف دانا پوری، ۱۹۳۔ ۱۸۶ و سیرت ابن ھشام، ج ۳ ص ۳۰۔ ۲۲۹)۔

آغاز جنگ سے قبل حیی بن اخطب نے کعب بن اسد سے ساز باز کر کے بنو قریظہ کا معاہدہ تڑوا دیا۔ (سیرت ابن ھشام، ج ۳۔ ۲۳۵)۔ جو نبی اکرمؐ کے ساتھ تھا۔ اس خبر کو سن کر مسلمانوں کو سخت پریشانی لاحق ہوئی اور بنو قریظہ کی طرف سے حملہ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرنے کے لئے حضورؐ نے فوری طور پر تین سو سپاہیوں کا دستہ مامور کیا ادھر منافقین اور تھڑ دلے لوگوں نے بے اعتمادی اور بزدلی کی باتیں پھیلانا شروع کر دیں اور بعض گھروں کی حفاظت کے بہانے

مورچے سے جانے لگے یہاں تک طعن کیا جانے لگا کہ "ایک طرف تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کی کنجیاں پانے کی بشارت دیتے ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص آج رفع حاجت کے لئے بھی اطمینان سے نہیں جا سکتا۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۳ ص ۲۲۸)

اسلامی تحریک کے پاسبانوں کو سب سے زیادہ اضطراب انگیز حالات اسی موقع پر پیش آئے۔

مگر علمبرداران حق کے لئے اللہ تعالیٰ کی تائید خاص تھی۔ اس لئے ایک طرف خندق کی نئی دفاعی تدبیر دوسری طرف قریش اور بنو قریظہ کی سازباز توڑنے میں نعیم بن مسعود کا حکیمانہ کمال، تیسری طرف حضورؐ اور آپؐ کے تربیت یافتہ قائدین اور پوری جماعت کا مضبوط مجاہدانہ کردار اور چوتھی طرف مشیت کی بھیجی ہوئی آندھی نے یہ نتیجہ دکھایا کہ دشمن

دیکھا یک میدان سے اس طرح رخصت ہو گیا جیسے کبھی کبھی بدلیا چھٹ جاتی ہیں۔

پھر ایک موقع غزوۂ تبوک کا ہے جب کہ مدینہ کے پانچویں کالم نے اپنے فن لطیف کے کچھ شاہکار پیش کئے۔ ہرقل روم حضور کا دعوت نامہ پانے ہی سے برافروختہ تھا۔ بیچ میں ارباب سازش نے بھی دربار روم میں رسائی حاصل کر کے اسے اکسانے کی کوششیں کی تھیں۔ خبر اڑی کہ ہرقل نے چالیس ہزار کا لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا ہے۔

حالات کچھ عجیب تھے۔ قحط کا زمانہ تھا۔ درختوں میں پھل تیار تھے۔ موسم سخت گرم تھا۔ فوجی بڑی تعداد میں زیادہ فاصلے پر روانہ کی جانی تھی۔ مگر مالیات کا پہلو کمزور تھا۔ اور سواری، سازوسامان اور نان ونفقہ کی صدرجہ قلت تھی۔ اسی لئے اسے "جیش عسرت" کا نام بھی دیا گیا ہے۔ منافقین نے اس

حالت کو دیکھ کر اور یہ اندازہ کر کے کہ اس معرکہ میں غنیمت ہاتھ آنے کا کم ہی امکان ہے ۔ عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی اور جھوٹے عذر گھڑ گھڑ کر بیٹھ رہے ۔ اس پہلو سے اسے غزوہ فاضحہ (یعنی منافقین کا پول کھول دینے والا معرکہ) بھی کہتے ہیں ۔ عذارت کی مضحکہ انگیز نوعیت کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ جد بن قیس نے آکر حضورؐ سے کہا کہ لوگ جانتے ہیں کہ مجھے عورتوں کی طرف بہت زیادہ رغبت ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ بنی الاصفر کی عورتوں کو دیکھ کر فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں ۔ لہذا مجھے معذور رکھئے ۔ یہ لوگ خود تو رہے ہی تھے ہر کسی سے کہتے پھرتے تھے کہ خدا خدا کرو، دیوانے ہو گئے ہو ۔ اس جھلستی گرمی میں تم جہاد کرنے چلے ہو ۔ (وقالو لا تنفروا فی الحر) انہوں نے ایک اڈا سویلم یہودی کے مکان پر بنا رکھا تھا اس میں لوگ جمع ہوتے تو ان کو غزوہ میں جانے سے روکتے ۔ آخر اس اڈے کا ناپاک وجود ہی ختم کر دیا گیا ۔

ادھر عبداللہ بن ابی کی فعال شخصیت نے ثنیۃ الوداع میں ذباب کی جانب یہودیوں اور منافقوں پر مشتمل ایک الگ لشکر شر پسندانہ مقاصد کے لئے ترتیب دے لیا جو خاصی تعداد میں تھا۔ لیکن یہ لشکر حضورؐ کے ساتھ روانہ نہ ہو سکا۔

پھر لشکر کی روانگی کے بعد ان لوگوں نے ایک اور فتنہ پیدا کر دیا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اہل بیت کی دیکھ بھال کے لئے بطور ذاتی نائب کے چھوڑا تھا۔ یہ لوگ کہنے لگے کہ آج کل محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت حضرت علیؓ کے بارے میں مکدر ہے۔ اسی لئے ان کو ساتھ لیا نہیں۔ حضرت علیؓ کی غیرت کو اس نشتر نے ابھار دیا اور ہتھیار لگا کر آپ حضورِ پاکؐ سے جا ملے اور منافقین کی شر انگیزی کا قصہ بیان کیا۔ حضورؐ نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیجا کہ مدینہ میں ان لوگوں سے خدشہ ہے۔

تبوک پہنچ کر ساتھ جانے والے منافقین (اور پچھ نہ پچھ

تعداد فتنہ انگیزی کے لئے ہمیشہ شریک ہوتی تھی) نے حق کے سپاہیوں کو یہ کہہ کر ڈرانا شروع کیا کہ بنو اصفر کے شیر دل جنگ آزماؤں کو تم لوگوں نے عربوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ کل تم پر اپنی غلط فہمی کا حال کھل جائے گا جب کہ تم سب کے سب غلام بن کر جکڑے ہوئے ہو گے باز پرس کی گئی تو کہنے لگے کہ ہم تو مذاق مذاق میں کچھ باتیں کر رہے تھے کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا۔ (اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف داناپوری ص ۳۸۵۔۳۶۱)

رومی لشکر تو آیا نہیں تھا۔ لیکن اس مہم سے ایک طرف رومیوں کو اندازہ ہوگیا کہ مدینہ پوری طرح چوکنا ہے اور ہمارے مقابلے پر آنے کی طاقت رکھتا ہے۔ دوسری طرف ایلہ، جربا اور دومۃ الجندل کے علاقے زیر اثر آ جانے سے بیرونی حملے کے امکانات کم ہو گئے۔

اس سفر میں دو مواقع پر حضورؐ نے چشموں سے

بلا اجازت پانی پینے سے فوج کو منع کر دیا تھا لیکن بعض منافقوں نے حکم عدولی کر کے اپنے دلی روگ کو عیاں کر دیا۔ اسی سفر میں عقبہ کے مقام پر حضورؐ کو ہلاک کر دینے کی ناکام سازش کی گئی جس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔

اہل نفاق کی اتنی غداریوں اور سازشوں کے باوجود حضورؐ اس مہم میں کامیابی حاصل کر کے واپس ہوئے اور بڑی شان سے آپ کا خیر مقدم کیا گیا۔ واپسی پر پیچھے بیٹھ رہنے والوں نے پیش پیش ہو کر عذر بیان کیے اور آپؐ درگزر کرتے گئے۔ تین مخلص ساتھی کعب بن مالک، ہلال بن امیہ و مرارہ بن ربیع جو تساہل کی وجہ سے رہ گئے تھے انہوں نے اعتراف قصور کیا اور ان کو پچاس دن تک حکم الٰہی کے انتظار میں معاشرے سے الگ رہنا پڑا۔ اس امتحان سے یہ لوگ اس خوبی سے گزرے کہ انہوں نے اپنے آپ کو زریں کردار سے مالا مال کر لیا ان کی سچی توبہ قبول ہوئی مگر منافق کہتے تھے کہ عجب بے وقوف لوگ ہیں

ہماری طرح کوئی عذر کر دیتے خواہ مخواہ اپنے آپ کو وبال میں ڈال لیا ہے۔ اب بھگتیں۔ اندازہ کیجئے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی تحریک کو کیسے کیسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑا ..... اور نوع انسانی کو فلاح کا راستہ دکھانے والی ہستی کو بیرون سوئی اور ان کے پیدا کردہ منافقین کے ہاتھوں کیسی کیسی غدارانہ کارروائیوں سے سابقہ پیش آیا۔ مگر اسلامی ریاست کا پھیلاؤ بڑھتا ہی گیا۔ تحریک حق کی شعاعیں فضاء میں پھیلتی ہی چلی گئیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام گونجتا ہی چلا گیا، اخلاص پھولا اور پھلا، مگر غداریوں کے جھاڑ جھنکاڑ پھل تو کیا لاتے، ان کی جڑیں ہی اکھڑ گئیں۔

قریش کی ذلیل انتقامی حرکات

مدینہ کے ابتدائی دور میں ..... جنگ چھڑنے سے قبل

..... قبیلہ اوس کے ممتاز سردار سعد بن معاذ عمرہ کرنے کے لئے

مکہ معظمہ گئے۔ امیہ بن خلف سے چونکہ ان کے دیرینہ تعلقات تھے، اس لئے اسی کے ہاں قیام کیا۔ وہ امیہ کو لے کر کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ اتفاقاً ابوجہل بھی ادھر آنکلا۔ اس نے پکار کر امیہ سے پوچھا: "کون ہے تمہارے ساتھ؟" امیہ نے بتایا کہ سعد ہیں۔ ابوجہل نے غضبناک ہوکر کہا کہ تم لوگ ان بدمذہب (صابی) لوگوں کو پناہ دیتے ہو"۔ پھر سعد سے کہا کہ "میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ تم لوگ کعبہ میں قدم رکھ سکو۔ اگر تم امیہ کی حمایت میں نہ ہوتے تو آج زندہ بچ کر نہ جاسکتے"۔ (سیرت النبی از شبلی نعمانی، ج ا ، ص ۲۸۴، بحوالہ مسلم و بخاری)

دیکھئے سیاسی انتقام کا جذبہ قریش کے ایک لیڈر کو یہاں تک لے آیا ہے کہ وہ خدا کے گھر کے دروازے اس کے بندوں پر بند کرتا ہے اور ان کو ایک عبادت سے محروم کرنا چاہتا ہے، گویا کعبہ بھی ان لوگوں کی ایک جاگیر تھی اور حرم کی تولیت کو انہوں نے درحقیقت اپنی سیاسی قوت کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ یوں تو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جن رفقاء کو ہجرت پر مجبور
کردیا گیا تھا، ان کے لئے حرم پاک کے دروازے بند تھے تاہم
مگر سعد بن معاذ کو یوں صاف لفظوں میں روک کر ابوجہل نے
اپنی غلط پوزیشن کو بری طرح الم نشرح کر دیا۔ ادھر سعد بھی کوئی
خودی کش درویش تو تھے نہیں، ان کے اندر اسلام کی روح حمیت
کارفرما تھی اور وہ مدینہ کی سیاسی قوت کے معنی جانتے تھے......
انہوں نے مختصر لفظوں میں ایسا جواب دیا کہ ابوجہل اور قریش
کے سامنے ایک خطرہ عظیم نمودار ہو گیا۔ سعد نے کہا: "اگر تم
نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا (تجارتی) راستہ روک
دیں گے"۔ دوسرے لفظوں میں یہ قریش کی معاشی شاہ رگ کو
کاٹ دینے کی دھمکی تھی۔ اس دھمکی نے سارے مکہ کو چونکا دیا۔
بعد میں مدینہ کی پالیسی سعد کے اسی قول کے مطابق تشکیل پائی۔
اور قریش بے بس ہو کر آخری بازی کھیل جانے پر تیار ہو گئے۔
ابوجہل جذباتی ہیجان میں کہنے کو تو یہ کہہ گیا لیکن اس بے جا دھمکی

سے قریش کے اثر کو سخت دھکا لگا۔ قرآن نے ان کی حرم کی اس ٹھیکیداری کو جس کے بل پر وہ بندگان خدا کو خانۂ خدا میں داخلے سے روک رہے تھے، بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا، دیکھئے:

.......''اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور (اس طریقے سے) ان کی ویرانی کے درپے ہو''۔ (البقرہ۔۱۱۴)

.......''لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا بہت برا ہے مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے''۔ (البقرہ۔۲۱۷)

.......''لیکن اب کیوں نہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) ان پر عذاب نازل کرے جبکہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اس

مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں"۔ (الانفال۔۳۴)

اور قرآن کی یہ بات تمام عرب میں آہستہ آہستہ پھیلتی گئی۔ اور قریش کی مذہبی دھاک کا زور کم ہوتا گیا۔

خود صلح حدیبیہ (ذیقعدہ ۶ھ) کے موقع پر قریش نے "صد عن المسجد الحرام" کا ذرا بڑے پیمانے پر مظاہرہ کیا۔ ایک القائے غیبی کے تحت سرور عالمؐ نے فقط عمرہ کے ارادے سے یہ سفر کیا۔ کوئی نفیر جنگ نہیں ہوئی۔ رضا کارانہ طور پر لوگ عمرہ کے لئے نکلے۔ قربانی کے جانور ساتھ لے گئے اور جنگی ضرورت سے اسلحہ بندی کے بغیر محض معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے ساتھ قافلہ روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر مشہور مقررہ شعار کے مطابق قربانی کے اونٹوں کو نشان زد کیا گیا اور ان کے گلے میں قلاوے ڈالے گئے۔ اس سے ایک نظر میں دیکھنے والے کو اندازہ ہوسکتا تھا کہ یہ اونٹ حرم میں قربانی پیش کرنے کے لئے لے جائے جارہے ہیں۔ یہ جنگی سواریاں نہیں ہیں۔ راستہ ہی

میں مخبر...... بشر بن سفیان الکعبی...... کے ذریعہ اطلاع مل گئی کہ بنی کعب بن لوی جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور کسی قیمت پر حرم میں نہ جانے دیں گے۔ حدیبیہ پہنچ کر حضورؐ نے پیغام بھجوایا کہ ہم لڑنے نہیں آئے بلکہ عمرہ کرنے آئے ہیں۔ بدیل بن ورقاء خزاعی نے مصالحت کی کوشش کی۔ پھر عروہ بن مسعود نے گفت و شنید کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد بنی کنانہ کے ایک شخص حلیس بات چیت کرنے کے لئے بیچ میں آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے جب قلادہ والے اونٹوں کا ایک سیلاب وادی میں متحرک دیکھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اور اس نے کہا: ”سبحان اللہ! ہرگز مناسب نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کو بیت اللہ کے داخلے سے روکا جائے“۔ جب اس نے اپنا یہ تاثر قریش سے بیان کیا۔ تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کی حوصلہ شکنی کی کہ تم دیہاتی آدمی ان معاملات کو کیا جانو۔ حلیس کو اس پر بڑا رنج ہوا۔ اس نے کہا:

”اے قریش! ہمارا تمہارا یہ معاہدہ نہیں۔ نہ اس پر ہم نے حلیفانہ

تعلق قائم کیا ہے۔ کیا خدا کے گھر سے ایسے شخص کو روکا جائے گا جو اس کی شان بڑھانے کے لئے آیا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں حلیس کی جان ہے تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو موقع دو کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں کریں ورنہ ہم اپنے تمام گروہوں کو واپس لے جاتے ہیں"۔

حضورؐ کا سیدھا صاف موقف اس شخص کے دل میں گھر کر گیا تھا اور اس کی حس تمیز کام کرنے لگ گئی تھی۔ اور اس کا ضمیر قریش کی دھاندلی کے خلاف حرکت میں آ گیا تھا۔ آخر اس کی دل داری کرتے ہوئے یہ بات کہہ کر اسے ٹھنڈا کیا گیا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مناسب شرطیں منوالی جائیں۔ تم ذرا خاموش رہو۔ پھر شرطیں ایسی طے کیں کہ حضورؐ اور آپ کے رفقاء کو ۶ ھ کے اس مجوزہ عمرہ سے عملاً روکا اور اور کچھ بہانہ نہ بن سکا تو اپنی ہٹ پوری کرنے کے لئے اسے ایک برس کے لئے موخر کرادیا۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۱۹۴-۱۹۸، سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص

۱۴۔ ۲۵۵، اصح السیر مولانا عبدالرؤف دانا پوری، ص ۱۸۔۲۱۰)

قرآن نے اس موقع پر بھی کعبہ کے اجارہ داروں کی پستی کردار کو یہ کہہ کر نمایاں کیا:

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے (دین حق) سے انکار کی راہ اختیار کی اور تم کو مسجد حرام سے روکا، اور اس میں رکاوٹ ڈالی کہ قربانی کے جانور اپنے حلال ہونے کے مقام تک پہنچ سکیں"۔ (فتح۔ ۲۵)

شعائر دینی...... جو ابراہیم علیہ السلام کے دور سے متفق علیہ چلے آرہے تھے...... میں قریش کی اس رخنہ اندازی نے ان کا موقف بری طرح کمزور کیا اور انہوں نے اپنی حماقت سے اپنے حق میں ایک مخالفانہ چرچا سارے عرب میں پیدا کر دیا۔ یہ بات عام لوگوں پر کھل گئی کہ قریش خدا ترسی، مذہب و تقویٰ کی اور

شرافت کے جوہر سے خالی ہوکر سراسر خدم خدا پر اتر آئے ہیں۔

قریش کے جذبۂ انتقام کا کمینگی کی حد تک جا پہنچنا شاید اس سے بڑھ کر کسی اور واقعہ سے واضح نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے دل ٹھنڈے کرنے کے لئے حضورؐ کی صاحبزادیوں کو ان کے شوہروں سے طلاقیں دلوائیں۔ یہ بڑے زہریلے ڈنک تھے جو محسنِ انسانیت کے کلیجے پر لگائے گئے۔

حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم (رضی اللہ عنہما) ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ دستور کے موافق انتہائی قرابت دار گھر میں ان کا یہ تعلق پہلے سے قائم تھا۔ ابولہب کی آتشیں شخصیت اتنی عالی مرتبہ کبھی تھی ہی نہیں کہ وہ اصولی نزاع کو ذاتی اور نجی تعلقات سے الگ رکھ سکتا۔ اور قرابت داری کے حقوق کو اختلافی لپیٹ میں نہ آنے دیتا۔ وہ

اپنے بغض میں ہمیشہ تند اور اپنے کرتوتوں کے لحاظ سے ہمیشہ پست رہا ہے اس کی ذلیل حرکتوں کی بناء پر جب سورۂ لہب نازل ہوئی اور آسمانوں سے صدا دی گئی کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ یعنی وہ ساری مخالفانہ حرکات سے کام لینے کے باوجود تحریک اسلامی کا بال بیکا نہیں کرسکتا اور سچائی کی طاقت اس کے ہاتھوں کو توڑتی ہوئی آگے بڑھ جانے والی ہے تو وہ جھنا گیا اس نے اپنے دونوں بیٹوں پر دباؤ ڈالا کہ اب یہ بات تمہارے لئے قطعاً حرام ہے کہ تم محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو اپنے گھروں میں رکھو اور ان کو طلاق نہ دو۔ حضرت رقیہ اپنے گھر میں بس رہی تھیں۔ عتبہ نے باپ کے اشارے پر طلاق دے دی اور بعد میں حضرت عثمانؓ سے ان کا ازدواج ہوا۔ ابولہب کو بھڑکانے اور اس کے بیٹوں کو اس حرکت پر آمادہ کرنے کے لئے قریش کے دوسرے سرداروں نے بھی خاصا کام کیا انہوں نے باہم دگر اس امر پر غور کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ

وسلم) کو پریشان کرنے کا سلسلہ کچھ رک سا گیا ہے۔ کوئی نیا نشتر تیز کرنا چاہیے۔ جس سے کچھ اور ناسور ڈالے جاسکیں۔ کیوں نہ ان کی صاحب زادیوں کو اپنے مشرکوں سے طلاق دلوائی جائے تاکہ ایک نئی مصیبت اس شخص کے لئے پیدا ہو جائے۔ اس مشورہ کے تحت انہوں نے عتبہ بن ابی لہب کو پیش کش کی کہ قریش کی جس عورت کو چاہو گے فراہم کر دی جائے گی بس شرط یہ ہے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو اپنے سے الگ کر دو۔ سو اس ظالم نے یہ اقدام کر ڈالا۔ عتبہ نے ذرا زیادہ تندی دکھائی اور حضرت ام کلثوم کو طلاق دے کر دندناتا ہوا سرورِ عالمؐ کے پاس پہنچا ڈھٹائی سے کہنے لگا کہ "میں نے تیرے دین سے کفر کیا۔ اور تیری بیٹی کو طلاق دی۔ نہ تجھے مجھ سے محبت ہے اور نہ میں تجھے پسند کرتا ہوں"۔ نہایت گستاخانہ انداز سے دست درازی کی اور حضورؐ کا کرتہ نوچا۔ ایک قرابت دار کا اپنے کینہ توز باپ کی شہ پر ایک طرف ایک شریف زادی کو طلاق دے کر ظلم کرنا اور

دوسری طرف یوں غنڈوں کی طرح پیش آنا اتنا تکلیف دہ واقعہ تھا کہ بے اختیار حضورؐ کی زبان سے یہ بددعاء نکلی کہ: "اے اللہ اپنے درندوں میں سے کسی درندے کو اس پر مسلط کر"۔ ابو طالب نے سنا تو عتیبہ سے کہہ دیا، کہ اب تمہیں میرے بھتیجے کی اس بددعاء سے کوئی تدبیر نہ بچا سکے گی چنانچہ شام میں ایک جگہ وہ تجارتی قافلے کے ساتھ شب باش ہوا اور رات کو ایک شیر نے سارے قافلے میں چھانٹ کر اسی کا سر چبا لیا۔ (المواہب اللدنیہ، ج ا ص ۱۹۷)

حضرت رقیہ کی وفات کے بعد حضورؐ نے اپنی ان دوسری صاحب زادی ام کلثوم کا نکاح بھی حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ اسی لئے آنجناب ذوالنورین کہلائے۔ غرض کفار قریش نے جس طرح عتبہ بن ابی لہب پر دباؤ ڈالا تھا ٹھیک اسی طرح انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابو العاص پر بھی زور دیا اور ان کو بھی وہی پیش کش کی کہ تم اگر

بنت محمدؐ کو طلاق دے دو تو جس بہترین عورت پر نظر ڈالو گے تمہارے نکاح میں دے دی جائے گی ابو العاص میں شرافت کا جوہر تاباں موجود تھا۔ انہوں نے کہا کہ خدا خدا کرو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی اہلیہ کو جدا کر دوں۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ زینبؓ کے بدلے میں قریش کی اور کوئی عورت میرے گھر میں ہو۔ بعد میں حضورؐ ابو العاص کی اس مضبوطی کردار کی تعریف فرماتے تھے۔ اور ان کے اس شریفانہ رویہ کا جواب انہوں نے دو موقعوں پر بہت بڑے احسانات کی صورت میں دیا۔ ایک اس وقت جب وہ اسیران بدر میں آئے تھے اور فدیہ میں حضور زینب کا بھیجا ہوا ہار واپس کر لیا۔ اور دوسری بار جب کہ ان کا تجارتی مال مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور حضورؐ کے اشارے سے وہ جوں کا توں ان کو لوٹا دیا گیا۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۹۶)

جنگ بدر کے بعد جب ابو العاص کو حضورؐ نے بطور

احسان خاص کے رہائی دلوائی تو باتوں باتوں میں ان سے وعدہ

لیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ آنے کا موقع دیں گے۔ یہ بات

عام لوگوں سے مخفی رہی چنانچہ حضرت زینب کی روانگی کے مقررہ

وقت پر دو صحابیوں حضرت زید بن حارثہ اور ایک انصاری کو بھیجا

کہ تم یاجج (ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے ۸ میل کی دوری پر تھی)

کے بیچ ٹھہرنا اور جب زینبؓ آجائیں تو ساتھ لے آنا۔ ادھر ابو

العاص نے حضور زینبؓ کو تیار کیا اور انہوں نے سامان وغیرہ

درست کر لیا۔ ان کا دیور کنانہ بن ربیع علی الصباح ان کو ہودج

میں بٹھا کر نکلا۔ قریش کو خبر ہوئی تو ان خبیثوں نے سوچا کہ محمد

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی یوں چلی جائے تو حیف ہے۔ کچھ

لوگ تعاقب کو نکلے اور ذی طوی میں ان کو جا لیا۔ ہبار بن اسود

نے بچھر کر ہودج پر تیر چلایا حضرت زینبؓ اس وقت امید سے

تھیں۔ تیر لگنے سے وہ سنگین حادثہ سے دوچار ہو گئیں اور جنین کا

اسقاط ہو گیا پھر جب ان کے دیور نے تیر و کمان درست کر کے

ان کو للکارا تو مکہ کے یہ غنڈہ مزاج بہادر پیچھے ہٹ گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں ابو سفیان بھی آپہنچا۔ اس نے دور ہی سے حملہ آوروں کو پکار کر کہا کہ میری بات سنتے جاؤ اس نے کنانہ بن ربیع کو ٹوکا کہ آخر یہ تم نے کیا کیا کہ علی الاعلان اس بی بی کو لے نکلے۔ حالاں کہ تم دشمنی کی اس فضا کو جانتے ہو جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے ہمارے سر پہ محیط ہے۔ یوں دن دہاڑے اس طرح کے اقدام میں مکہ کے لوگ ذلت محسوس کرتے ہیں مجھے اپنی جان کی قسم ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو روکنے سے کچھ غرض نہیں۔ اس وقت اسے واپس لے چلو۔ کسی وقت چپکے سے لے جانا۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مکہ والے حضورؐ کو اذیت پہنچانے کے لیے کن آخری حدودِ خباثت کو چھو رہے تھے ان کے دلوں میں قرابت کا کوئی لحاظ نہیں رہا تھا۔ ان کو ایک عورت ہاتھ

اٹھاتے ہوئے شرم نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ان کے حلقوں میں ظلم کو ظلم سمجھنے کا مادہ ہی ختم ہو چکا تھا اور ان کی نگاہوں میں انسانیت کی کوئی قدر اور ہم جنسوں کے کوئی حقوق باقی نہیں رہے تھے۔

(سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۹۔۲۹۶، اصح السیر مولانا عبدالرؤف داناپوری، ص ۴۰۔۱۳۹)

اب ایک اور واقعہ لیجئے جو سرتاسر خونخوارانہ ذہنیت کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے حضور نے ملحقہ علاقوں میں تعلیمی وفود بھیجنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسکے تحت غزوہ احد کے متصلاً بعد (ماہ صفر میں) عضل وقارہ (بنو ہذیل) کے لوگوں کی خواہش پر ...... جس کے پیچھے سازش کام کر رہی تھی ...... چھ آدمیوں کا ایک وفد روانہ کیا جس میں سے چار کو بمقام رجیع (چشمہ، ُراز) شہید کر دیا گیا اور حضرت خبیب اور حضرت زید بن دثنہ کو قیدی بنا کر مکہ لے جایا گیا۔ (واقعہ رجیع کے دوسرے پہلو تفصیل سے ہم بعد کی ایک فصل میں دے رہے ہیں۔ اسی طرح

ترسیل وجود کا تذکرہ بھی دوسری جگہ آئے گا)۔ وہاں بنو ہذیل کے دو قیدی قریش کے پاس تھے۔ جنہیں تبادلہ کرکے انہوں نے چھڑا لیا۔ حجیر ابن اہاب تمیمی نے حضرت خبیب کو عقبہ بن حارث بن عامر کے لئے لے لیا تا کہ ان سے حارث کا بدلہ لے جسے حضرت خبیب نے میدان بدر میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ زید بن دثنہ کو صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں قتل کرنے کے لئے خریدا۔

یہ اپنی شجاعت کے گن گانے والے میدان میں قلیل التعداد اور بے سروسامان مسلمانوں سے پٹنے کے بعد اب "بے بس قیدیوں کی جان لے کر آتش کینہ کو بجھانا چاہتے تھے۔ اسلامی معاشرہ کی دو قیمتی ہستیوں کو اگرچہ شہادت کا پیالہ پلا دیا گیا۔ لیکن اس موقع پر دونوں کے کردار کا ایسا تقابل ہو گیا کہ ان کے اثرات وقت کی تاریخ کی رگوں میں پھیل گئے۔

صفوان نے زید بن دثنہ کو اپنے غلام نسطاس کے سپرد کیا

کہ وہ حرم کے باہر تنعیم میں جا کر ان کا کام تمام کر دے۔ اس

دلچسپ ڈرامے سے خوش وقت ہونے کے لئے قریش کا ایک

مجمع موقع پر موجود تھا اور ان میں ابو سفیان بہ نفس نفیس شریک

تھا۔ ابو سفیان نے قریب ہو کر زید سے پوچھا کہ کیا تمہیں یہ پسند

ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے اور تم اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی

خوشی رہو سہو اور تمہارے بجائے ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا

خاتمہ کر دیں۔ زید جس کے سامنے موت کھڑی مسکرا رہی تھی

ایمان کی بلندیوں سے جواب دیتا ہے:

"واللہ ہم لوگوں کو اتنی سی بات کے عوض بھی آزاد ہو کر اپنے اہل و

عیال میں جا رہنا پسند نہیں کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

جہاں ہیں، وہاں بھی ان کو ایک کانٹا تک چبھے"۔

ابو سفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا اور پکار اٹھا کہ میں

نے کسی کا ایسا محب نہیں پایا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو

اس کے رفیق محبوب رکھتے ہیں۔ پھر اس مجسمہ صدق وصفا کو تلوار کا لقمہ بنادیا گیا۔ کون جانتا ہے کہ زید کے اس کردار نے کتنے دلوں میں جگہ بنالی ہوگی اور کتنی روحیں قریش کی اس ظالمانہ اور کمینہ کارروائی پر ماتم کررہی ہوں گی۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۳۔ص ۱۶۰۔۱۶۵) اصح السیر مولانا عبدالروف دانا پوری، ص ۱۷۰)

حضرت خبیب بعد تک قید میں رہے۔ قید میں رہ کر انہوں نے اپنے ایمان واخلاق کی جو جھلک متواتر دکھائی اس کا ایک واضح نتیجہ تو یہ ہوا کہ حجیر بن اہاب کی لونڈی ماویہ بعد میں اسلامی تحریک میں جذب ہوگئی اور اسی کے ذریعہ حضرت خبیب کی روداد اسیری سامنے آئی۔ ماویہ کا بیان ہے کہ ان کے قتل کا مقررہ وقت جب قریب آگیا تو انہوں نے صفائی کے لئے استرہ منگوایا جو بھجوادیا گیا۔ مگر بعد میں یہ دیکھ کر زمین میرے پیروں تلے سے نکل گئی کہ استرہ ان کے ہاتھ میں ہے اور چھوٹا بچہ خبیب

کی گود میں بیٹھا ہے۔ جس قیدی کو اس ظالمانہ طریق سے زندگی

سے محروم کیا جا رہا ہو۔ اس کے قابو میں دشمن کا ایک بچہ آ جائے

اور ہتھیار بھی اس کے ہاتھوں میں ہو تو جو اندیشے ہو سکتے ہیں،

ظاہر ہیں۔ میرے اضطراب کو خبیب نے بھانپ لیا اور اطمینان

دلایا کہ میں کسی حال میں اس معصوم کی جان نہیں لینے کا۔ انہوں

نے فوراً لڑکے کو الگ کر دیا۔ یہ بلندئ کردار کیا ایک مشعل کی

طرح مکہ کی تیرہ و تار فضاؤں میں جگمگا نہ اٹھی ہوگی۔

پھر ان کو صلیب پر چڑھانے کے لئے تنعیم لے جایا

گیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اجازت لے کر آخری نفلی نماز بہ

اطمینان پڑھی۔ اور شہادت گاہ الفت میں قدم رکھنے والوں کے

لئے ایک مبارک سنت قائم کر دی۔ پھر جلدی فارغ ہو کر کہا کہ تم

یہ نہ سمجھو کہ میں موت کے ڈر سے نماز میں تاخیر کر رہا ہوں، اور یہ

مختصری دعا مانگی:

"اے اللہ! ہم نے تیرے رسول کا پیغام پہنچادیا۔ تو کل اس بستی کو اس سے آگاہ فرمادے جو کچھ کہ ہمارے ساتھ ظلم ڈھایا جارہا ہے

اے اللہ! ان (دشمنوں) کی تعداد کو کم کر۔ ان کو تفرقہ میں ڈال کر ہلاک کر اور ایسے خونخواروں میں سے کسی کو جیتا نہ چھوڑ"۔

وہ صلیب پر لٹکا دیئے گئے اور آخر میں ابو مغیرہ نے حربہ مار کر ان کا رشتۂ حیات منقطع کر دیا۔ عین اس آخری لمحے ان کی زبان پر کچھ اشعار آئے جس میں سے مشہور ترین یہ ہے:

ولست ابالي حين اقتل مسلماً   علي اى شق كان في الله مضجعي

میں جب اسلام سے مالا مال ہو کر قتل کیا جا رہا ہوں تو پھر مجھے اس بات کی کچھ فکر نہیں ہے کہ خدا کی راہ میں مجھے کس کروٹ گرنا نصیب ہو رہا ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۶۶۔۱۶۵، اصح السیر مولانا عبدالرؤف دانا پوری، ص ۱۶۱)

ان دو جانوں کو لے کر قریش نے بزعم خویش یہ سمجھا ہوگا کہ ہم نے تحریک اسلامی کی قوت گھٹا دی، لیکن ان کو اندازہ نہیں تھا کہ ان مظلوموں کے خون شہادت کے قطرے دلوں کی کھیتیوں میں ایسے بیج بن کر پڑ رہے ہیں کہ آگے چل کر ان سے اسلام کی نئی فصلیں لہلہا اٹھنی تھیں۔

انہی گھٹیا انتقامی حرکات کے ساتھ ہم قریش کی اس سیاسی خیانت کو بھی پیش کرتے ہیں جس کا مظاہرہ انہوں نے معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ کر کیا۔ اس عظیم تاریخی معاہدہ کے تحت طے پایا تھا کہ عربی قبائل میں سے جس کا جی چاہے وہ قریش کے ساتھ معاہدانہ تعلق قائم کرے اور جس کو پسند ہو وہ اسلامی ریاست کے ساتھ حلیفانہ رشتہ استوار کر لے“۔ قبائل کو پوری آزادی ہوگی اور کسی طرح سے ان پر جبر نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ وہیں موقع پر بنو بکر نے قریش سے اور بنو خزاعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدانہ تعلق جوڑ لیا۔

دورِ اسلامی سے قبل ان دونوں قبیلوں کے درمیان ایک

قتل کے سلسلے میں انتقام در انتقام کا منحوس چکر چل رہا تھا اور ان

کے مابین متعدد واقعات قتل ہو چکے تھے۔ بنو بکر اپنی باری پر بدلہ

لینے کے لئے تُل رہے تھے کہ اسلامی تحریک نے تاریخ میں شدید

مدوجزر پیدا کر کے جاہلی عرب کے تمام قبائل کی توجہ ادھر کھینچ لی

اور وہ باہمی معاملات کو درکنار رکھ کر اس نئے پیغام کی مخالفت

میں صف بستہ ہو گئے۔ تحریک اسلامی کے عناد نے جو سطحی سا

اتحاد ان میں پیدا کر دیا تھا۔ اس کا زور معاہدۂ حدیبیہ کے بعد

ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اب ان لوگوں کو اپنے پرانے جھگڑے یاد

آئے۔ بنو بکر کی ایک شاخ بنو دیل تھے۔ بنو دیل کے ایک شخص

اسود بن رزن کے مقتول لڑکوں کا بدلہ لینے کے لئے بنو دیل کے

سردار نوفل بن معاویہ نے قبیلہ کے لوگوں کو ساتھ لیا اور ایام ہدنہ

(یعنی مصالحت) کے وقفے کو غنیمت جان کر بنو خزاعہ پر حملہ کیا

اور آغاز شرارت کے طور پر چشمۂ الوتیر کے پاس ایک خزاعی

کے خون سے ہاتھ رنگے۔ بقیہ خزاعی اس نادیدہ عہد شکنی کی وجہ سے سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ اور انہیں حملہ آوروں نے تعاقب کر کے قتل کر دیا۔

قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر بنو بکر کو ہتھیار بھی فراہم کیے اور رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر خزاعیوں سے لڑے۔ بنی خزاعہ نے حرم میں جا کر پناہ لی۔ اور بنو بکر کے سردار کو پکار کر کہا کہ "اے نوفل! دیکھو اب ہم حرم میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب باز آ جاؤ...... خدا کے لئے! خدا کے لئے!!" مگر وہ فتح کے نشہ میں بہک رہا تھا۔ اس نے کہا "آج کوئی خدا نہیں، اے بنو بکر! اپنا پورا پورا بدلہ لو! کیا حرم کے احترام میں اپنی عزتوں کا انتقام لینا فراموش کر دو گے"۔ چنانچہ ان ظالموں نے حرم میں خونریزی کی اور پچھ خزاعی بمشکل جانیں بچا کر بدیل بن ورقاء اور اس کے غلام رافع کے مکان میں جا چھپے۔

قریش نے قبائلی رقابتوں کے تحت جذباتی ہیجان میں

آکر یہ اتنی بڑی بڑی حماقت کی جس کا خمیازہ انہیں نقد نقد بھگتنا

پڑا۔ یہی واقعہ فتح مکہ کا محرک ہوا۔ قریش نے قطعاً نہ سوچا کہ

تحریک اسلامی کی لحظہ بہ لحظہ آگے بڑھتی ہوئی طاقت ورد کے

مقابلے میں ان کی قوت اخلاقی اور سیاسی دونوں لحاظ سے حد

درجہ گر چکی ہے اور ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے عرب کے قبائلی معاشرہ میں

قریش کی بدعہدی کا چرچا ہوا ہوگا اور ان کی ساکھ حد درجہ گر گئی

ہوگی۔ پھر بنو بکر کی انتہائی ظالمانہ روش اور بنو خزاعہ کی حد درجہ

شان مظلومی نے تمام قبائل کو چوکنا کر دیا ہوگا کہ قریش کی قیادت

امن اور انصاف بہم نہیں پہنچا سکتی۔ پھر اس واقعہ میں خدا کے نام

کے تقدس اور حرم کی حرمت کو صدیوں کی روایات کے خلاف

جس بری طرح سے پامال کیا گیا تھا اس نے عوام کے دلوں میں

جذباتی ہلچل برپا کر دی ہوگی۔ اس ہنگامے سے قریش نے اپنا

وزن نظام عناصر کے پلڑے میں ڈال کر اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ علاوہ ازیں قریش نے سوچا تو یہ ہوگا کہ ہم اسلامی ریاست کے ایک حلیف کو کچل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی آتش کینہ کو ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم جاہلی نظام کی پشت پناہی کرنے والے بچے کھچے قبائل کا شیرازہ اپنے ہاتھوں سے درہم برہم کر رہے ہیں اور بعض ہمسایہ قبائل کو خود ہی دھکیل کر مدینہ کے حوالہ کر رہے ہیں۔

دراصل ہر بوسیدہ نظام اور ہر فرسودہ قیادت...... جو اعلیٰ اصول ومقاصد اور اخلاقی معیارات اور تعمیری نقشہ تمدن سے محروم ہو کر محض اس منفی مقصد کو اپنا لے کہ وقت کے افق سے ابھرنے والی ہر اصلاح پسند اور تعمیر کیش قوت کو کچلنا ہے...... اس کی تقدیر یہی ہے کہ اس کی عقل اسے حماقتوں کی راہ پر لے جاتی ہے۔ اس کا زور اسے ضعف کے گڑھے میں گراتا ہے۔ اس کا احساس برتری اسے ذلیل کرتا ہے اور اس کی پیش قدمی اس کی

پسپائی کا موجب بنی ہے۔

عمرو بن سالم خزاعی مدینہ روانہ ہو گئے اور سرورِ عالمؐ کے حضور میں جا کر بنو بکر اور قریش کے مظالم کی داستان دردِ دل شگاف اشعار میں بیان کیا:

لاھم انی ناشد محمدا	حلف ابینا وابیہ الاتلدا
فانصر ھداک اللہ نصرا اعتدا	وادع عباد اللہ یاتوا مددا
فی فیلق کالبحر یجری مزبدا	ان قریشا اخلفوک الموعدا
ھم بیتونا بالوتیر ھجدا	وقتلونا رکعا وسجدا

"اے اللہ! ...... میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیمی گھرانوں کے درمیان ہوا ہے۔ (اے پیغمبرؐ!) ہماری مدد کیجئے اور خدا کے بندوں کو پکاریئے تاکہ وہ مدد کے لئے آپؐ کے گرد مجتمع ہوں۔ ایک ایسے لشکر جرار کے درمیان اٹھیے جو سمندر کی طرح موجزن ہو کر جھاگ اٹھا رہا ہو۔ کیونکہ قریش نے آپ کا معاہدہ توڑ ڈالا ہے۔ انہوں نے ہمیں رات

کی تاریکی میں وتیر کے پاس آگیا۔ سوتے میں ہم پر حملہ کیا اور پھر ہمارے لوگوں کو رکوع و سجود کرنے کی حالت میں گھائل کیا''۔ (لاھم کے بجائے یا رب بھی روایت کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن ہشام کے یہاں)

جواب ملا: ''نصرت یا عمرو بن سالم'' تمہاری امداد کی جائے گی۔

اب قریش کی آنکھیں کھلیں کہ ہم نے کیسی ہلاکت انگیز حرکت کر ڈالی اور ابو سفیان دوڑا دوڑا مدینہ پہنچا تاکہ تجدید عہد کرائے۔ مگر وہاں کی فضا کا عالم یہ تھا کہ ابو سفیان اپنی بیٹی کے گھر جا کر جب بستر پر بیٹھنے لگا تو بیٹی نے بستر لپیٹ کر اٹھا لیا۔ اور کہا کہ ''یہ رسول اللہ کا بستر ہے اور تم ایک ناپاک مشرک ہوتے ہوئے اس پر نہیں بیٹھ سکتے''۔...... ابو سفیان نامراد لوٹا اور چند ہی دن بعد یکا یک مکہ نے دیکھا کہ ایک عظیم لشکر اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ج

۴، ص ۱۳۔۱۴) اصح السیر مولانا عبدالرؤف دانا پوری، ص ۹۰۔۸۸۔ سیرت النبی شبلی نعمانی، ج ا، ص ۷۔۲۶۶)

ان واقعات سے یہ واضح ہے کہ اس تاریخی کشمکش میں جاہلی قیادت کی منفی قوت کو اس کا ہر قدام، اس کی ہر شرارت، اس کی ہر انتقامی حرکت اور اس کی ہر مزاحمانہ کارروائی کمزور کرتی چلی گئی اور دوسری طرف مثبت اصولی اور تعمیری طاقت آہستہ آہستہ زور پکڑتی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

ان حرکتوں کے مقابلے میں آپ ذرا محسن انسانیت کے طرز عمل کو دیکھئے کہ فریقین کے درمیان حالت جنگ چل رہی ہے اور ثمامہ اسلام قبول کر کے مستقل طور پر مکہ کو جانے والی غلہ کی رسد کو بند کر دیتا ہے عین اسی زمانے میں مکہ کے لوگ قحط سے دوچار تھے۔ حضور نے مکہ کے غریب طبقوں کا خیال کرتے ہوئے یمامہ سے از خود کہہ کر رسد جاری کرائی اور پھر

اپنے پاس سے فقراء مکہ کے لئے پانچ سو اشرفیاں روانہ کیں۔ ایک اسی احسان نے مکہ کے عوام کے دلوں کو کس طرح موہ لیا ہوگا۔ ایک روایت میں تو یہ آتا ہے کہ مکہ والوں نے خود حضورؐ کو لکھا کہ ''آپؐ تو صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔ لیکن آپؐ نے ہمارے ساتھ یہ رشتہ توڑ لیا''۔ یہ فقرہ بھی مذکورہ ہے کہ قتلت الآباء بالسیف والا بناء بالجوع'' ۔ باپوں کو تلواروں سے ختم کر دیا اور ان کی اولادوں کو بھوکوں مار رہے ہو''۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۴، ص ۳۱۰۔ اصح السیر مولانا عبدالروف، ص ۱۱۹، رسول کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ، ص ۱۴۱)